

محاسن خطوطِ غالب

ج
انتخابِ خطوطِ غالب

تألیف

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

پیش کش

بزمِ اقبال ، لاہور



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

محاسنِ خطوطِ غالب

انتخابِ خطوطِ غالب

تألیف :

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

پیش کش :

بزمِ اقبال ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر	پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اعزازی ٹیکر ٹری
بزم اقبال نرسنگ کلاس بھارڈنزا ۲- کلب روڈ- لاہور	
فون: 6363056	
کمپوزنگ :	۱- ریاض احمد صاحب ۲- پریل کمپوزنگ سنٹر لاہور (فائنل)
مطبع :	حاجی محمد حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور
اشاعت :	مارچ ۲۰۰۳ء
تعداد :	۱۱۰۰ (ایک ہزار ایک سو)
صلحات :	۲۰۸
قیمت :	۱۳۰/- روپے

ISBN 969-8042-27-X

یہ منصوبہ حکومت پنجاب کی مالی معاونت سے شائع کیا گیا ہے

فہرست مضامین

۶ - ۵

پیش لفظ

اقبال اور مرزا غالب

حصہ اوّل

۱۵ - ۹

غالب شتہ کے بغیر

حصہ دوم

۵۴ - ۱۸

خطوط غالب کے مجموعے

۳۳ - ۲۶

غالب کی اردو شتر

۶۷ - ۳۳

محاسن خطوط غالب

۸۱ - ۶۸

غالب کا اجتماعی احساس

حصہ سوئم

۸۳

الف - انتخاب خطوط غالب

۸۴

۱ - خواب امین الدین احمد

۸۶

۲ - علاؤ الدین احمد طائی

۱۰۳

۳ - میرزا اشہاب الدین احمد نقشب

۱۰۵

۴ - میرزا قربان علی بیگ سالک

۱۰۶

۵ - فشی ہرگوپال تانت

- ۶۔ مرزا حاتم علی بیگ میر ۱۳۰
 ۷۔ غوثی شہید زائن آرام ۱۳۱
 ۸۔ میر مہدی حسین محمود ۱۳۳
 ۹۔ خواجہ غلام غوث خاں بخیر ۱۶۸
 ۱۰۔ انور الدین نواب سدا اللہ خاں شفیق ۱۷۱
 ۱۱۔ حکیم غلام نجف خاں ۱۷۳
 ۱۲۔ نواب یوسف مرزا ۱۷۷
 ۱۳۔ نواب میر غلام بابا خاں ۱۸۱
 ۱۴۔ نواب ابراہیم علی خاں وفا ۱۸۴
 ۱۵۔ حکیم سید احمد حسن مودودی ۱۸۴
 ۱۶۔ محفل حسین خاں ۱۸۳
 ۱۷۔ میاں داد خاں سیاح ۱۸۳
 ۱۸۔ میر حبیب اللہ ڈاکا ۱۹۱
 ۱۹۔ چوہدری عبدالغفور سرور ۱۹۴
- ب۔ نشریات ۱۹۸-۱۹۵
 ج۔ مکتوب الہیم کا مختصر تعارف ۲۰۳-۱۹۹

پیش لفظ

۱۹۶۹ء میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر راقم نے ایک مختصر سا نثریہ عقیدت ”محسن خطوط غالب“ کے عنوان سے پیش کیا تھا جس میں چند مقالات مرزا غالب کی نثری نگارشات کے سلسلے میں (۱۔ خطوط غالب کے مجموعے ۲۔ غالب کی اردو نثر ۳۔ محسن خطوط غالب ۳۔ غالب کا اجتماعی احساس) کے علاوہ ۱۸۸ خطوط غالب کا ایک انتخاب بھی دیا گیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے ادبی ملتوں میں اس تالیف کو پند کیا گیا اور خصوصاً طلب کے لیے مطالعہ غالب کے ضمن میں یہ مجموعہ از حد معاون و مددگار ثابت ہوا۔ اس کا واحد ایڈیشن ایک ہزار کی تعداد میں فروری ۱۹۶۹ء میں خوبصورت چاپ کے حروف میں مکتبہ خیابانِ ادب لاہور نے چھپوایا تھا اور اس قیمت پر فروخت کیا تھا اور یہ نسخہ جلد ہی نایاب ہو گیا۔ مکتبہ خیابانِ ادب بھی اس بارزانی کی پاداش میں حوادثِ زمانہ کی نذر ہو گیا اور میں بھی دوسرے تدریسی و تالیفی کاموں میں مصروف رہا۔ اور اگرچہ غالب کا خیالِ لوحِ اکبر سے محروم نہیں ہوا مگر بقول انجی کے:

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

دو سٹے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

ایک زمانہ بیت گیا۔ اس دوران ایک آدھ مضمون بھی غالب کے بارے میں لکھ سکا اور یہ غالب ۱۹۸۰ء میں نکلا گیا تھا اور ”نثر“ میں شائع ہوا اور اس کا عنوان بھی یہی تھا۔ ”غالب خستہ کے بغیر“ اب ۳۳، ۳۳ سال کے بعد اپنے نئے مسکن میں کتابوں کوٹھیلوں میں ترتیب دیتے وقت ”محسن خطوط غالب“ کا ایک پرانا نسخہ نظروں کے سامنے آ گیا اور یہ کہہ کر میرا منہ

چنانچہ لکھا: ”واہ جی داد! آپ تو ہمیں بھول ہی گئے!“ نہیں بہت نام ہوا۔ اس عداوت کے احساس نے مجھ پر کیا کفری طور پر اس نسخے کی طباعت کا بندہ بست کروں۔ چنانچہ ۱۹۸۸ء کے لکھے ہوئے مضمون کو اس طباعت میں شامل کر کے اب اس کا عنوان بھی دوہرا کر دیا ہے: ”غالب خستہ کے بغیر“۔ حصہ اول۔ ”محاسن خطوط غالب“۔ حصہ دوم اور ”انتخاب خطوط غالب“۔ حصہ سوم۔

اتفاق سے انہی دنوں بعض پاکستانی یونیورسٹیوں کے اساتذہ جن کے تصانیفات ایم۔ اے۔ اردو میں مرزا غالب کی نثر اور شاعری کا خصوصی مطالعہ شامل ہے ”محاسن خطوط غالب کی تلاش میں میرے پاس بزم اقبال میں تشریف لائے اور غالب کی نثر کے خصوصی مطالعے کے اس سلسلے میں تذکرہ بالا تالیف کی نایابی کا تذکرہ کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ کتاب جو نہیں نے اپنے طلبہ کی سہولت کی خاطر ہی ۳۵-۳۰ سال قبل لکھی تھی، اس کی اب ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی فوری کپیڑنگ اور طباعت کی ذمہ داری اپنے ایک دوست اور کرافٹرز کے سپرد کی مگر اس میں بھی کچھ تاخیر ہو گئی۔ بہر کیف بقول غالب اس میں کوئی شکست تھی:

ہوئی تاخیر تو کچھ ہا صحت تاخیر بھی تھا

امید ہے قارئین نور خصوصاً طلبہ (جن کی خاطر، اپنے استاد گرامی ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے نقش قدم میں میں بھی در سائنہ تحقیق و تنقید کو اپنا سرمایہ افتخار سمجھتا رہا ہوں) اس طباعت کو جانی کو پسند فرمائیں گے۔

محاسن خطوط غالب کا یہ اضافہ شدہ ایڈیشن بزم اقبال کے اہتمام میں شائع ہو رہا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے غالب سے اقبال کے جتنی تعلق اور واسطے کو بھی واضح کر دیا جائے۔ اس لیے اگلے صفحے پر ایک مختصر تشریحی مضمون ”اقبال اور مرزا غالب“ پیش کیا جا رہا ہے۔ والسلام

(پروفیسر ڈاکٹر) غلام حسین ذوالفقار

اقبال اور مرزا غالب

اُردو شاعری میں اقبال کے پیش روؤں میں مرزا غالب کا شمار سرفہرست ہے۔ اقبال غالب کی شاعری اور نثر سے طالب علمی کے زمانے ہی سے متاثر تھے۔ اس تاثر کا قہن موت اُن کی نظم ”مرزا غالب“ ہے جو ”غزل“ کے شمارے ستمبر ۱۹۰۱ء میں یعنی آج سے ایک صدی پیشتر شائع ہوئی تھی اور پھر ”ہفت روزہ“ (اشاعت ازل ۱۹۲۳ء) کے مجموعے میں ”ہمالہ“ کے بعد شروع میں آتی ہے اور غالب سے اقبال کا ذہنی رشتہ ”جاوید نامہ“ (اشاعت اول ۱۹۳۲ء) تک جاری رہتا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس ذہنی رشتے کے حوالے سے اسی اولین نظم ”غالب“ میں ہم ”اقبال“ غالب اور گوئے ”گو بھی ہم تو آؤ کیجئے ہیں۔“

اس لحاظ سے میں اپنی تالیف ”محاسن خطوط غالب“ کو علامہ اقبال سے معنون کرتا ہوں اور ذیل میں افتتاحیہ کے طور پر حضرت علامہ کی یہ نظم درج کی جاتی ہے جو غالب کی فکری و فنی خوبیوں کا اعتراف بھی ہے اور اظہار بھی:

مرزا غالب

کبرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پر غریغِ خفیل کی رسائی تا مہیا
تھا سراپاِ روحِ ثو' بزمِ سخن بیکہ ترا نہ ب محفل بھی رہا محفل سے پہناس بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس لحسن کی منکور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر طے میں جو مستور ہے

فصل ہستی تری برہم سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندی کے نقسوں سے شکوہ کو سار
تیرے فردوں کی عقل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشتِ فکر سے آگے ہیں عالم سبز و دار

دعائی مفسر ہے تیری شاعریِ حقیر میں
تاب گویائی ہے بخشش ہے لب تصویر میں

فلک کو سنو ناز ہیں تیرے لب اچاز پر مجھ حیرت ہے شہنا رفعت پرواز پر
شاہد مضمونِ تصدیق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے پیچھے دلی فکری شیراز پر

آجائو اُجڑی ہوئی دلی میں آرا میدہ ہے
گلشنِ دیر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لذت گویائی میں تیری ہمسر ممکن نہیں ہو تجلیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نہیں
ہائے! اب کیا ہوگئی ہندوستان کی سرزمین آدا اے نظارہ آسمانِ نظامِ کھنکھ میں

گھیسوئے آرد ابھی منت پذیر شان ہے
شیخ یہ سوداگی دسوزی پروانہ ہے

اے جہان آجدا اے گوارہِ علم و فکر میں سراپا پائے خاموش تیرے بام و در
ڈرتے ڈرتے میرے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں ٹکڑ

دنِ تجھ میں کوئی فکر روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں چہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

غالب خستہ کے بغیر!

مصریروں کا سلسلہ ددانہ ہے۔ لمبے ساعتوں میں، ساعتوں میں، دن صبحوں میں اور ماہ و سال صدیوں میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ زمانے کی اس تند و سبک سیر و میں شخص اور تہذیبی نقوش ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ ہی کا حصہ نہیں بن جاتے بلکہ آفاقی فکر و احساس کی لہروں سے مل کر حیات چاودھاں کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شخصیت اور ان کا فن بھی انہی ادبی و تہذیبی نقوش میں شامل ہیں۔ غالب کو رحلت کیے اب ایک سو تینتیس چونتیس سال ہو گئے ہیں۔ زمانے کی تقویم نیکراں میں تو سو سو سال کا عمر ایک لختے ہی کی حیثیت رکھتا ہے مگر افراد کی حیات و ممات میں اتنا عمر بھی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ غالب کے زمانے کی بہت سی سریر آوردہ استیلاں آج قصہ پارینہ کی نذر ہو چکی ہیں مگر اپنے زمانے میں ناقد و نری کا حکار غالب پہلے سے زیادہ زندہ و تابندہ ہے اور اس کے فکر و فن کا مطالعہ مختلف جہتوں سے ہو رہا ہے۔

کائنات کی ہر شے متحرک، درواں دواں، عروج و زوال کی بلند یوں اور پستیوں سے دوچار ہے۔ غالب کو اس انقلاب دوراں کا پورا احساس تھا:

ہیں زوال آمدہ اجزا آخر پیش کے تمام

بہر گردوں ہے چرخ را بگرد باد یاں

افراد اور اقوام سب اس آئینہ قیام میں اپنی اپنی جلوہ گری دکھا کر اپنی منزل مراد کو جا لیتے ہیں۔ مگر فردا سے بے پرواہ افراد اور تاریخ ام سے بے خبر اقوام اپنے انجام کو جلد پہنچ جاتے ہیں۔ مگر باشعور افراد اور عاقبت اندیش اقوام پیش امر و ز میں فرق ہونے کی بجائے اپنے دوش و فروا کا محاسبہ کرتی اور زندہ رہتی ہیں۔ غالب کے ہاں ترکانہ ورٹے میں پیش امر و ز کا احساس

بہشت موجود ہے مگر وہ اس میں اپنے شعور و آگہی کی بدولت ڈوب چکے تھیں۔ ان کی بے پناہ حس اور اک اپنے گرد و پیش کے بدلنے ہوئے حالات کا فطری تجربہ قدم قدم پر کرتی ہے اور انہیں رذو قبول کی راہیں کھاتی رہتی ہے۔

زمانے کی تندوبک سرور میں ٹھکوں کی طرح پہچے ہوئے ذکی انہیں افراد کی طرح غالب کو بھی اپنے نیست و نابود ہو جانے کا احساس ستاتا ہو گا، اور وہ مہذب انسان کے اس مقسوم پر خائف حقیقی سے شکایت آمیز اور درد انگیز لہجے میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہوں گے:

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے

لوہج جہاں پہ حرف کمر نہیں ہوں نہیں

حیات غالب کی گرہیں کھولنے والوں نے ان کی زندگی کے ایک ایک گوشے کو بے نقاب کرنے کی سعی، تبلیغ کی ہے۔ مگر مغل مہدی حالیہ شان عمارتوں کی طرح غالب کی بہشت پہلو شخصیت بہت کچھ بے نقاب ہونے کے بعد بھی اپنے کئی پہلوؤں اور گوشوں اور پرتوں کو پردہ دراز میں رکھے ہوئے ہے اور شاید اسی اسرار و اخفای میں اس کی دلکشی پنہاں ہے۔ جس شخص کی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسعت، سیرانی اور پھر بھی تکذیبی کا یہ عالم ہو کہ:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور پھر جس شخص کا تصور حسن و جمال بھی اتنا بے کراں ہو کہ:

سب کہاں، کچھ لالہ و لعل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور جو اپنے احساسِ گناہ کے سلسلے میں ناکرہ گناہوں کی حسرت و غلش کے لیے بھی خالقِ حقیقی سے داد خواہ ہے:

ناکرہ گناہوں کی بھی حسرت کی لے داد

یا رب اگر ان کرہ گناہوں کی سزا ہے

اپنے شخص کے کردار اور قول و فعل کو بندھے نکلے روایتی پانوں سے کیوں کر چاہنا جاسکتا

ہے ایسا شخص عقلہ خیز ہوتا۔ مجتہد ہوتا ہے۔ وہ روایت سے ہٹاوت کو نہیں کرتا مگر اپنی دستخط جہاں کہو خیال اور اپنی بے پناہ قوت تحقیق سے وہ کہنہ روایات کا راسخ حق سمت کی طرف موڑ دینے پر قادر ہوتا ہے۔ غالب، فاری اور اردو کی ہزار سالہ شعری تہذیبی روایت میں ایک ایسا ہی مجتہد ہے جس نے اعلیٰ عشق، عظیم فکر اور اعلیٰ فن کی محکم روایات سے بھرپور استفادہ کیا، مگر وہ ان کا سیر نہیں بنا، اس نے بندھے کئے اصولوں، مضامینوں اور نظریوں سے انحراف بھی کیا اور ایک حقیقی روانہ پنہ نظر، شاعر اور ادیب کی طرح وہ نئے افسانے و آفاق کی جستجو میں مستانہ اور وادی و طہال طے کرتا چلا گیا:

ہے تہے سرحدِ ادراک سے اپنا سکھو
قبلے کو اصلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
-۵۱-

مستانہ طے کروں اُنوں رو وادی و طہال
تا، بازگشت سے نہ رہے دعا مجھے

اعلیٰ عشق میں غالب کی فنا (خودی) روایت کے عظیم کو مستعد و پہلوؤں سے توفیقی اور نئے ممکنات کی جستجو اور نئے رویوں کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی واضح مثال ان کے ہاں فارسی، اردو کی شعری روایت کے مسئلہ ابطال (میروز) کے تذکرے کے سلسلے میں ملتی ہے جن کا ذکر وہ اس طور پر کرتے ہیں جس میں کچھ نہ کچھ ان مشاہیر کی تحقیر اور بے وقعتی کا پہلو دکھاتا ہو۔ یہ نہتہ تحقیقی جہتوں کی دریافت اور اپنی عاشقانہ عقلیت کے اظہار کی ایک انوکھی صورت ہے۔ قصص، کہیں، منصور و غیرہ اعلیٰ عشق کے ناموروں کا تذکرہ غالب کے شعروں میں جہاں بھی آیا ہے وہاں کم بیش یہی انداز ملتا ہے۔ یعنی اپنی برتری اور ان مشاہیر مشائخ کی کتری کا پہلو۔ چند شعروں میں یہ صورت احوال ملاحظہ کیجئے:

تکرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تھکدہ بھگ ظرفی، منصور نہیں
عشق و غرور و برتری، شہر ت سبہ خسرو، کیا خوب
ہم کو حلیم بک، نامی و لڑبا نہیں

چشمے بغیر مر نہ سکا کوکبن، اسدا
سر گھٹتہ، شمار زینوم و قیود تھا

قدہ دیکھو میں قیس و کوکبن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و دین کی آزمائش ہے

دیکھیے پہلے تین شعروں میں منصور اور فرہادی عقلیت کو خلیج کرتے ہوئے ان کی تفسیر کا
کوئی نہ کوئی پہلو نکال گیا ہے اور آخری شعر میں تو واضح طور پر قیس و کوکبن کو عام قسم کے عشاق
قرار دیتے ہوئے جاننازی کے نقطہ نظر سے اپنی برتری کا دعویٰ کر دیا گیا ہے۔ انسانی فکر و عمل کی
امکانیہ باتوں کے لحاظ سے یہ روایت عقلی قابل قدر کہی جاسکتی ہے۔

مگر غالب کے روایت پرست معاصرین اُس کے فکری و فنی اجتہاد کو قدر کی نگاہوں سے نہ دیکھ
سکے۔ بعض معاصرین نے تو انہیں بے سرو پا اور مُہمل گو تک بھی کہہ ڈالا۔ غالب اپنے زمانے کی
اس ناقدی کے شاکِی تھے۔ وہ جہاں مُہمل گوئی کے اس الزام کے جواب میں بڑی بے نیازی
سے یہ منطقی اعزاز اختیار کرتے ہیں:

نہ ستائش کی حتما نہ صلے کی پروا
مگر نصیب ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

وہاں مثبت اعزاز میں اپنے نکتہ پیمیزی کی لفظی موٹائیوں کا فہم شعر اور ذوقِ سخن
کے اس حقیقی نظریے کے حوالے سے مُسکوت جواب بھی دیتے ہیں:

نحسن فروغِ شمع سخن زور ہے اسد
پہلے دل گواختہ پیدا کرے کوئی

یہ تو خیر غالب کے بعض روایت پرست معاصرین کی تنقیدی اور کتاہ نظری تھی کہ وہ ان
کے شعری اجتہاد کا کمالِ اعتراف نہ کر سکے، اور نہ غالب کو غالب بنانے میں اُس عہد کا بھی خاصا
حصہ ہے جو دو قہذ یہوں کے تصادم کا دلخراش منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف قدیم قہذ یہ کے

غرض نہا کاغذ وایاں تھے جو نہ صغیر میں صدیوں کے تہذیبی عمل اور اسلامی اثرات کا نتیجہ تھے، مگر گزشتہ ایک صدی میں ذوال و انحطاط کی آمد میں نے انہیں بچ و بچ سے ہلا دیا تھا۔ دوسری طرف انگریزی راج کے ساتھ مغربی تہذیب اپنی جدید ٹیکنالوجی اور استعماری استحصال کے جتلا میں فاتحانہ کڑوہ سے آدرش تھی۔ غالب کے دل میں قدیم تہذیب کے رنگارنگ جنگ سے سخت لگاؤ و فردوسِ گوش کا منظر بن کر بسے ہوئے تھے، مگر ان کا عقلی رویہ انہیں نئے دور کی ترقیات اور تہذیبوں کو غوش آمدید کہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ دل اور دماغ کی یہ کشمکش ذوق اور اچائی و درودنم سے مل کر غالب کے گہرے ذہن میں ایک بڑا تاثیر تہذیبی سر قیام بن جاتی ہے جسے انور و یکس تو اس میں اس مہدی و داستانِ دنگداز کے علاوہ خال ملیں گے جنہیں شاعر کے عقبِ خوں نے رنگین بنایا ہے۔

۱۸۵۷ء کے اہم پہلوؤں خوں لکھاں میں شہرِ دہلی کا ذرہ و ذرہ، جسے مسلمانوں نے اپنے مہدی عروج میں ستاروں کی چمک دی تھی، اُن کے لہو کا پیا سا بن جاتا ہے تو غالب کا دل خون ہو جاتا ہے اور یہ لہو اُس کی آنکھوں سے ٹپک کر اس شعر میں ذمل جاتا ہے:

شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
کتنے خوں ہے ہر مسلمان کا

غالب کو کیا پتہ تھا کہ جو رستم کی یہ داستانِ خونچکاں کو سہ سال بعد پھر دہلی کے کوچہ بازار میں ڈھرائی جائے گی، اور اُن کا یہی شعر ایک بار پھر اُن کے دیدہ و نمودار کا ترجمان بن جائے گا! بہر کیف، انیسویں صدی کے نصفِ اول کے فطیب و فرزانِ غالب کی نگاہوں کے سامنے گزرنے والے ۱۸۵۷ء کے قتلومِ خوں کے تو وہ خود ایک شہادر تھے۔ دلی کی بربادی اور مسلمانوں کے قتل عام اور مسلسل دار و گیر کے بعد بھی وہ اپنی قوم کے تہذیبی مرقہ کے نوحوہ طراں بن کر ۱۸۶۹ء تک جیتے رہے اور اپنے ہی اس شعر کی قتلِ جیتے رہے:

قلمِ ہستی کا اسد کس سے ہو تجر مرگ علاج
شیخ ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

۱۸۵۷ء سے قتلِ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار زیادہ تر شاعری میں ہوا۔ فارسی میں بھی اور اردو میں بھی۔ غالب کی غزل نگار اور فن کے لحاظ سے اُس حسین و جمیل

تہذیب کا آخری مرتع ہے جو اپنے مہذب عروج میں تاج محل، جامع مسجد، بادشاہی مسجد اور لال قلعے کی صورت میں داخل کر دینا کے سامنے آئی اور عجوبہ روزگار کہلائی۔ غالب کے زمانے میں یہ تہذیب آرزوؤں اور حتموں کے خیالی تاج محل ہی پیش کر سکتی تھی۔ حقیقی اور مادی تاج محل، مسجدیں، قلعے اور شاہیہاں بنانے کے وسائل غالب، بہادر شاہ ظفر اور ان کی قوم کی دسترس سے باہر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں جا چکے تھے۔ ”یوم آخر“ کا یہ فکر انگیز دور آرزو اور شکست آرزو کی کشاکش سے عبارت تھا، اور مرزا غالب کو قدرت نے اس کے خوش نوا اثر جان کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ دوسرے نظموں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مظہر تہذیب نے دم توڑنے سے قبل اپنی داستان عروج و زوال کی گھر انگیز مرتع نشی کے لیے مرزا غالب کو منتخب کر لیا تھا:

و فلک ندر اہوں نہ پردہ ساز

نہیں ہوں اپنی شکست کی آواز

طبع ہے مشاق لذت ہائے حسرت کیا کروں

آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

غالب کی ایک مشہور اور بحث طلب قطعہ بد نازل ہے جس کے مقابلے میں وہ کہتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مفردین خیال میں

غالب صبرِ خامہ نوائے سرور ہے

بعض لوگوں کے نزدیک یہ نازل واقعہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے متاثر ہو کر کہی گئی۔ یہ بات

درست نہیں۔ یہ نازل تو اس واقعے سے بہت پہلے کی ہے، لیکن اس کے بحر پر ایمانی انداز میں یہ

تہذیبی طغیانیہ (جس کا ذرا پ سین ۱۸۵۷ء کا واقعہ انقلاب تھا) پوری طرح نکھر کر سامنے آ گیا ہے۔

شاعری پیش، ساقیوں اور آغوشوں جس (وہ جان) بعض اوقات اُس سے ایسے ایسے اشعار بھی

کہلا دیتی ہے جو تمہا اس کے شعور یا اشعور ہی کا دستہ نہیں ہوتے بلکہ اُن میں اُس کے عہد کی زوہج

عصر بھی کارفرما ہوتی ہے۔ یہ شعر کسی ایک واقعے سے متعلق نہیں کہا جاسکتا، بلکہ سلسلہ واقعات و

حادثات کا فن کارانہ رد عمل معلوم ہوتا ہے:

دارغ فراق صہب شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خوش ہے

خود فرما ہے، کیا یہ وہی تہذیبی مجلس نہیں جس کے زندہ ہنگامے ایک ایک کر کے جہ
خاک سوتے چلے گئے اور بزم آخر کی شمع فروزاں اور اس کے ساتھ ہی شاعر کا دل سوزاں اُس کے
جل بجھنے اور مٹ جانے کا فکر انگیز نوحہ خواں بن کر ہمارے سامنے آ رہا ہے:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

نوحہ غم ہی سہی نوحہ شادی نہ سہی

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یہی فلسفی غالب اپنے اردو مکاتیب میں بھی دلی کی
بہاروں کے لٹنے کا ماتم کرتا ہے، کبھی مسلمانوں کی گزشتہ عظمت و شہرت کا حسرت بھرے ناعاز میں
تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی انصاف غم بہا کر اور کبھی ضبط غم کر کے آنسو ڈال اور آہوں کو مسکراہٹوں میں
بدلنے کی کوشش میں اعلیٰوں اور نکتہ آفرینوں کی پھلجھڑیاں پھوڑتا ہے، اور اپنا غم قلعہ کرتا اور احباب
کو بھی خوش مذاقی و زندہ دلی سے جینے کا حلیقہ سکھاتا ہے۔ غمِ عالم کے ماحول میں زندہ دلی کا یہ حوصلہ
پیدا کرنا غالب جیسے ہی عظیم فن کار کا فیضان ہے۔ دردِ ہلکی نظر جانتے ہیں کہ غالب کی اس شوقی،
بذلہ نچی اور خوش طبعی کے سوتے بھی دراصل اُس تہذیبی الجھے سے بنتے ہیں جس کا وہ زندگی بھر
فکر انگیز مرثیہ خواں رہا:

دل لگی کی آرزو ہے نیند رکھتی ہے ہمیں

دند یاں ہے رونقی سو چراغِ مٹتے ہے

محاسنِ خطوطِ غالب

خطوطِ غالب کے مجموعے

غالب کے موجودہ اردو خطوط کی روشنی میں مرزا کی اردو خطوط نویسی کا آغاز مارچ ۱۸۳۸ء میں ہوا، اور تقریباً دس گیارہ سال بعد (نومبر ۱۸۵۸ء میں) ان خطوط کی طباعت و اشاعت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ یہ سوال غالب کے شاگردوں غشی ہرگوپال تھتہ اور شیو نرائن آرام نے (غالب یا بھی مشورے سے) اٹھایا۔ ان دونوں حضرات کے خطوط موجود نہیں، لیکن غالب نے انہیں جو جواب دیا (آرام کے نام ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کو اور تھتہ کے نام دو دن بعد ۲۰ نومبر کو) اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اس سوال پر سخت کبیدہ خاطر ہوئے اور انہوں نے اس کا روشنی سے جواب دیا۔ اس طرح یہ مسئلہ پیدا ہوتے ہی دب گیا۔ تاہم اس کی اسکاٹنی صورت ضرور سامنے آگئی کہ غالب کے اردو خطوط میں احباب گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور کسی نہ کسی دلی، یہ فنی تحریریں منظر عام پر آ کر رہیں گی۔

دو تین سال گزرنے کے بعد ۱۸۶۱ء میں عبدالغفور سردار ہروی نے غشی محمد متاظمی خاں کے مشورے سے اپنے اور صاحب عالم و شاہ عالم کے نام خطوط (جو زیادہ تر طبعی نوعیت کے تھے) کی طباعت کا ارادہ کیا اور ۳۱ خطوط کا مجموعہ ”مہرِ غالب“ کے عنوان سے مرتب کیا۔ لیکن ۱۸۶۳ء تک یہ مجموعہ مشورے کی صورت میں پڑا تھا۔ سردار نے اس کو دیا ہے میں لکھا:

”اربابِ علوم کو معلوم ہو کہ میں اکھسار علیہ، عبدالغفور محتشم سپرد مار ہروی بدو

شعور سے اہلِ سخن کا طالب اور صاحبِ کمال کا خواہاں تھا۔ جب کلامِ بلاغتِ کلامِ رشک

صاحب، فخرِ غالب، جنابِ اسد اللہ خاں غالب کا دیکھا، دل کو بھایا، بیکہ پایا۔ ترسیل

مراعات میں قدم بڑھایا، ہر کتابت کا جواب آیا۔۔۔۔۔ جو نامہ کہ خاتمِ میرے

بہار سے اردو تحریر کیا، کتب سادہ روحوں سے دلہا تر، اور ہر سطر اُس کی سلسلہ موجوں سے

تاب فرسات زیادہ ہے۔ جس آنکھ نے دیکھا، وہ جانتا ہے۔ جس کان نے سنا، وہ سنتا ہے۔ جس تپا حلقہ ذہن اور آپ ہی آپ مزہ اٹھانا خلاف انصاف جانا۔ دل مالک تمام ہمہ امت عام ہوا، اور ہنوز یہ قصد تمام تھا کہ بحسن اتفاق فکر زباں، وحیہ و دریاں، جناب مستزلی خاں صاحب، محطین میرٹھ۔۔۔ رونق افزائے بارہرہ ہوئے۔۔۔ ایک روز مغل ممدوح میں ذکر ہمدانی و شیوہ بیانی جناب استاد ذی و جندوی درمیان آیا۔ اور شاید کیا کہ کلام میرزا صاحب نسیم چانقزادہ اور نسیم وکشا ہے۔ قاری کا کیا کہنا۔ آرو بھی یکسا ہے۔ نظم و شعر قاری تو مٹلی چھلی، اطہار ہوا، لیکن شعر آروزیہ رطیع سے عاری رہا۔ اگر وہ خطوط کو تمام تہہارے آئے اور تم نے سنائے ہیں، جمع کرو، تو میں اس کے اطہار کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔ اس تقریر سے نسیم تاثیر نے غیظہ دل کھلایا۔ غصائے خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کو تمام میرے آئے تھے، ترسیب دیے۔ گویا جواہر بے بہا کان قلدان سے نکال کر کشتی، اوراق میں جمع کیے۔ چونکہ محبت جناب غالب میرے حال پر بہت غالب ہے، لہذا نام اس انکشا کا "میر غالب" (بکسریم) مناسب ہے، سال فتم تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا۔^۱

غزوہ ہند کی:

"میر غالب" کی طباعت کا مرحلہ شروع نہ ہوا تھا۔ مٹلی مستزلی خاں کو خیال آیا کہ اگر اس میں کچھ اور احباب کے خطوط بھی فراہم ہو جائیں تو مناسب ہے۔ اس دوران میں مٹلی غوث بے غیر نے بھی غالب کے خطوط کا مجموعہ مرتب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب غالب بھی اس میں دلچسپی لینے لگے، اور انہیں تشویق ہوئی کہ یہ مجموعہ جلد از جلد چھپ جائے۔ اس کا اظہار مختلف خطوط میں ہوئے لگا:

"ہاں حضرت، کہیے مستزلی خاں کی سعی بھی مفکور ہوگی؟ وہ مجموعہ آرو چھپایا چھپا ہی رہے گا؟ احباب اس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے طلب کو ہر حد تک اضافہ کیا دیا ہے۔"

[خط تمام غلام غوث بخیر، ۷ مارچ ۱۸۶۳ء، خطوط غالب، از میر صفی ۳۳۸]

"بچہ و مرشد" کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں، مولوی عہد انصاف ان کا نام اور نساخ ان کا تخلص ہے۔ میری ان کی ملاقات نہیں۔ انہوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم

”دفتر پے مثال“ مجھ کو بھیجا۔ اس کی رسید میں یہ خطائیں نے اُن کو لکھ۔ چونکہ یہ خط مجموعہ نثر اردو کے لائق ہے، آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں۔ اور ہاں حضرت وہ مجموعہ چھپے گا بالتح۔ یا چھپے گا بالشم؟ چھپ چکا ہو تو حق تعالیٰ کی جتنی جلد میں ششی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اکتھا کرے فقیر کو بھیجے۔ والسلام۔

[ایضاً ۱۸۶۳ع، خطوط غالب میں ۳۳۰]

”ابھی حضرت، یہ ششی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقتے جمع کیے اور نہ چھپائے۔ فی الحال، پنجاب، عاظمیٰ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں، مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں، وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔“

[ایضاً، خطوط غالب میں ۳۵۲، ۳۵۳]

آخر غالب کا یہ مجموعہ خطوط ”مود ہندی“ (شامل مہر غالب) غالب کی وفات سے تقریباً چار ماہ و شتر اکتوبر ۱۸۶۸ع میں مطبع بنگھائی میرٹھ سے چھپا۔ ۱۸۸۸ء سلطنت کے اس مجموعے کے شروع میں دو دیباچے (عرض ناشر و دیباچہ سرور) ہیں۔ اس کے بعد فصل اول ”مہر غالب“ فصل دوم ”مود ہندی“ آخر میں خاتمہ (از قلم میرٹھی)، دو تقریریں اور تین دیباچے (جو غالب نے دوسروں کی کتابوں پر تحریر کیے)۔ یہ مجموعہ بہت لفظ سلاط چھپا۔ غالباً کتابت کسی اناڑی کاتب نے کی۔ اس مجموعے کے خطوط کی تفصیل یہ ہے:

(فصل اول) سرور ۲، صاحب عالم ۳، شاہ عالم ۲، (فصل دوم) شفق ۲۰،

مرزا یوسف مزین ۲، مجروح ۳۱، میر سر فرادوسین اعلیٰ ۱، نقتہ ۱، مہر ۱، ہے

خبر ۲۵، نسخہ ۱، شیفنا ۱، رحمت مراد آبادی ۱، مرزا رحیم بیگ ۱، شاکر ۱۰، جنون

بریلوی ۱۵، مزین الدین ۱، سید محمد عباس ۱، غنی غلام بسم اللہ ۱، ایک خط ظہیر

الدین خاں کی طرف سے اُن کے چچا کے نام۔ ایک خط بے خبر کا مرزا غالب

کے نام۔

اردوے معلّیٰ (حصہ اول):

جب مولوی ممتاز دلی خاں کے جمع کردہ خطوط کی طباعت میں تاخیر ہوئی اور احباب کی ”طلب سرحد تقاضا“ تک پہنچ گئی تو دلی کے احباب کو بھی خطوط غالب کے جمع کرنے اور شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اکمل الطالع نے طباعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس مجموعے کی ترتیب و طباعت میں غالب خود دلچسپی لے رہے تھے اور خطوط کی جمع آوری کے لیے احباب کو کلمہ رہے تھے۔ بہرِ خبر کے نام اس قسم کے ایک خط کا حوالہ طور بالا میں آچکا ہے۔ علانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع ”اکمل الطالع“ میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوارب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ نہیں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو کلمہ وہ جہاں بھیجتا ہوا، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہونگے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اور اس کو دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے۔“

[۱۸۶۳ع خطوط غالب، صفحہ ۹۴]

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ اردوے معلّیٰ (حصہ اول) اکمل الطالع دلی میں بہ حسن اہتمام سید فخر الدین ۳۱ ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۶ مارچ ۱۸۶۹ع روز مبارک جمعہ کو بساعت سعید و آدن حیدر چھپ کر تیار ہو گیا۔ غالب کا انتقال ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ع کو ہوا۔ یعنی یہ مجموعہ جو مرزا غالب کی زیر نگرانی دلی میں زیرِ طبع رہا اُن کی وفات کے انیسویں روز بعد زیرِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ ۳۶۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں آغازِ خاتمہ و غلط نامہ شامل ہیں۔ سرورق ہنر، بیلا مختلف رنگ کے کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ سرورق کی پیشانی پر غالب کا یہ شعر درج ہے:

جو یہ کہے کہ رختہ کیونکہ ہو رختہ فارسی

مغفہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اس کے بعد عنوان کتاب "اردوئے معلّیٰ" (حصہ اول)، اور اس کے نیچے یہ عبارت ہے:

"یعنی رقصات اردوئے نجم الدولہ و میر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المخلص بہ غالب، جو تعلیم اطفال کے لیے دستور العمل ہے۔"

اردوئے معلّیٰ کے شروع میں میر مہدی بخراج کی تقریب ہے۔ خاتم کتاب میرزا قربان علی بیگ خاں ساک نے تحریر کیا ہے۔ تعداد خطوط ۷۰۷ ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

نواب میر غلام بابا خاں ۱۰۔ خدا داد سیاح ۲۹۔ غشی حبیب اللہ خاں ذکا ۱۰۔ غشی ہر گوجال نقتہ ۸۹۔ ظہر اودہ بشیر الدین ۳۔ سید بدر الدین فقیر ۵۔ چوہدری عبدالغفور سرور ۱۶۔ میر سرفراز حسین ۲۔ میر مہدی حسین بخراج ۳۳۔ شاہ عالم ۲۔ صاحب عالم ۲۔ عبدالغفور شاخ ۱۔ عزیز ۱۔ قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی ۱۱۔ رحمان مراد آبادی ۲۔ عبدالرزاق شاکر ۲۔ مولوی مزین الدین ۱۔ مفتی سید محمد عباس ۱۔ حکیم غلام نجف خاں ۲۳۔ حکیم ظہیر الدین احمد خاں ۱۔ (حکیم ظہیر الدین خاں بنام نجم الدین حیدر اخطا) ۱۔ نواب میر ابراہیم علی خاں وفا ۵۔ مولوی احمد حسن صاحب قوی ۲۔ حکیم سید احمد حسن مولودی ۱۱۔ مختار حسین خاں ۱۔ مرزا حاتم علی مہر ۱۸۔ غشی مئی بخش مرحوم ۲۔ غشی عبداللطیف ۱۔ خواجہ غلام ٹوٹ بے خبر ۱۳۔ نواب ضیا الدین احمد خاں ۱۔ مرزا شہاب الدین احمد خاں ۷۔ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق ۱۹۔ میر افضل علی عرف میران صاحب ۳۔ مرزا قربان علی بیگ ساک ۲۔ مرزا شمس الدین علی بیگ رضوان ۲۔ مرزا باقر علی خاں کامل ۲۔ ذوالفقار الدین حیدر ۳۔ یوسف مرزا ۱۲۔ غشی شیونرائی آرام ۳۳۔ بابو ہر گوبند سہا ۷۲۔ نواب امین الدین احمد خاں ۶۔ مرزا علاؤ الدین احمد خاں ملائی ۵۶۔ مرزا امیر الدین احمد خاں ۱۔ میر احمد حسین میکش ۲۔ حکیم غلام محمد تفسی ۱۔ حکیم غلام رضا خاں ۱۔ باسٹر پیادے لال آشوب ۳۔ غشی جواہر سنگھ جوہر ۲۔ غشی ہیرا سنگھ ۱۔ غشی بہاری لال مشفق ۲۔

(۱) یہ غلام نے ظہیر الدین کی طرف سے لکھا تھا۔ اس میں قرآن کا احترام بھی مل رہا ہے۔

اردوئے معنی (حصہ دوم)

اردوئے معنی حصارِ ذل، جس میں ”صاف صاف مہارت کے غلط قرے کیے جاتا طلباء مدرسہ فاکہ اٹھائیں، دوسرے جسے میں مطالب مشککہ کی قرے اور تقریظ وغیرہ لکھی“ (اردوئے معنی، صفحہ ۵) ۱۸۶۹ء میں چھپ گئی لیکن اس کے دوسرے حصے کی طاعت نہ ہو سکی۔ ۱۸۹۹ء میں مولانا الطاف حسین حالی نے مطبع پنجابی دہلی سے اس حصے کو بھی چھپوا دیا۔ مولوی مہدالاحد مالک مطبع پنجابی کے بقول:

”اس حصے میں خاص کردہ رقعات ہیں جن میں انہوں (غالب) نے لوگوں کو اسلئے دئی ہیں، یا شاعری کے حقائق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض کتابوں کے دیباچے اور درجہ پوچھی ہیں۔“

اردوئے معنی (حصہ دوم) مطبوعہ پنجابی ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں ۷ کتابوں پر دیباچے اور تقریظیں ہیں۔ اس کے بعد ۵۳ خطوط ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

منشی ہر گوپال لکھنؤ ۳۳، پیارے لال آشوب، حبیب اللہ ذکا، میاں خدا داد سیاح، شہزادہ بشیر اللہ بن ۲، کیول رام ہشیار، مولوی کرامت علی، منشی جواہر سنگھ جوہرا، منشی میرا سنگھ، میر مہدی بھردج ۲۔

غالب کے ان مجموعہ ہائے خطوط کی طاعت کے بعد خطوط غالب کی دریافت و طاعت کا سلسلہ رساں گل میں بھی جاری ہو گیا۔ مولانا حسرت موہانی کے رسالے ”اردوئے معنی“ دسمبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں مولوی علی احمد بکراہی کے نام ۲۲، شیخ لطیف احمد بکراہی کے نام ۱) شائع کیے۔ شیخ مبارک علی نے مطبع کریم لاہور سے ۱۹۲۳ء میں اردوئے معنی حصارِ ذل دوم (کتاب) مع ضمیرہ کور بالا خطوط شائع کیا۔

مکاتیب غالب:

۱۹۳۷ء میں مولوی امتیاد علی خاں عرشی ناظم کتابخانہ راجپور نے مرزا غالب کے ان

خطوط کا مجموعہ ”مکاتیب غالب“ کے نام سے شائع کر دیا جو غالب نے نوابان راجپور (نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں) اور وہابستان (دربار کوکھے تھے۔ اس مجموعے میں صرف وہ خطوط مرتب کیے گئے ہیں جو دارالانشا میں محفوظ تھے۔ ۲

”مکاتیب غالب“ کے خطوط کی تعداد ۱۳۹ ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

فردوس مکاتیب نواب یوسف علی خاں ۳۳، ملحد آشاں نواب کلب علی خاں ۳، صاحبزادہ سید زین العابدین خاں ۲، صاحبزادہ سید عباس علی خاں جناب ۲، مفتی سلیم علی، خلیفہ احمد علی احمد امولوی محمد حسین خاں ۱۔

تادرات غالب:

مفتی محمد بخش حقیر سے مرزا غالب کے بہت گہرے اور قلمی مراسم تھے۔ اردو سے مفتی میں حقیر کے نام غالب کے صرف دو خطوط شامل تھے۔ بقیہ خطوط کا کچھ پتہ نہ تھا۔ یہ خطوط آفاق حسین آفاق دہلوی کو (جو میرن صاحب کے نواسے ہیں) کے ذریعے ملے۔ انہوں نے خطوط کا یہ مجموعہ ”تادرات غالب“ کے نام سے ۱۹۳۹ء میں مشہور پریس کراچی سے شائع کر دیا۔ اس مجموعے میں ۲ خطوط مفتی محمد بخش حقیر کے نام، اور ۲ خطوط (نمبر ۷۳ و ۷۴) حقیر کے عزیز محمد عبداللطیف کے نام ہیں۔ خط نمبر ۷۲، ۷۳، ۷۴ اردو سے مفتی میں بھی شامل ہیں۔ ”تادرات غالب“ کے یہ خطوط ۱۸۳۸ء اور ۱۸۵۹ء کے دوران لکھے گئے۔ پہلا خط فارسی میں ہے اور شیخ آہنگ میں شامل ہے۔ دوسرا خط اردو میں ہے اور ۹ مارچ ۱۸۳۸ء کا تحریر ہے۔ یعنی غالب کے موجود اردو خطوط میں یہ پہلا اردو خط ہے۔ حقیر کے نام غالب کے ان خطوط کا یہ مجموعہ حیات غالب کا ایک اہم مآخذ ہے۔ مرتب نے اس مجموعے پر حواشی لکھ کر اسے قابل قدر بنا دیا ہے۔

تادری خطوط غالب:

دراختہ مستوی نے ۲۷ فردو خطوط کا مجموعہ پیش کیا جو کرامت حسین ہمدانی، حفیظ بکراہی اور صوفی منیری کے نام ہیں۔ محققین کے نزدیک اس مجموعے کا جو محل نظر ہے۔

خطوط غالب (از ہمیش پر شاد):

فنی ہمیش پر شاد پرہیز بنارس یونیورسٹی نے خطوط غالب کی از سر نو ترتیب صحیح کا بیڑا اٹھایا اور کچھ غیر مضبوط خطوط بھی شامل کیے۔ ان خطوط کی پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی لاہور نے ۱۹۴۱ء میں شائع کی۔ خطوط غالب کے اس مجموعے کو مزید اضافوں کے ساتھ مالک رام نے ۱۹۶۲ء میں چھپوایا۔

خطوط غالب (از غلام رسول مہر):

مولانا غلام رسول مہر نے اردو سے متعلق اور غور ہندی کی ترتیب نو ذکر اور غالب کے متفرق خطوط کو یکجا کر کے (ما سوا دو مجموعوں) مکاتیب غالب و نادرات غالب (اس ضخیم مجموعے میں پیش کیا ہے۔ مہر صاحب نے مکتوب الہیسم کے حالات و تاریخوں کی تصحیح واعدراج اور بعض خطوط کے حواشی لکھ کر اور خطوط کو از سر نو تاریخ وار ترتیب دے کر پیش کیا۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ خطوط غالب زیادہ قابل قدر اور غالب کی اردو نثر کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے مفید ہے) ہم نے محاسن خطوط غالب میں دیگر مجموعوں کے علاوہ اس مجموعہ "خطوط غالب" سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے اور حواشی میں زیادہ تر اسی مجموعے کے حوالے درج کیے ہیں۔

غالب کی اردو نثر

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اپنی جذبات پسند طبیعت اور نکتہ دس ذہن کی بدولت اردو نثر کے غالب میں زندگی کی جوشی روح پیوگی، اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ سمجھ سکتے ہیں۔ جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ غالب سے قبل اردو نثر ارتقا کی کن منزلوں کو طے کر چکی تھی اور اسالیب بیان کے اعتبار سے کس مقام تک پہنچی ہو چکی تھی۔ لہذا غالب کی اردو نثر کا جائزہ لینے سے پہلے ہم اجمال کے ساتھ غالب سے پہلے کی نثر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

اردو نثر کا باقاعدہ آغاز اگرچہ دکن میں بھنگی عہد سے ہوا اور قطب شاہی عہد میں اردو نثر کا ایک عظیم ادبی کارنامہ ”سب دس“ (از ملاو جی) تخلیق ہوا، لیکن اردو نثر کے ان دیکھنی صوفیوں سے شمالی ہندو اعلیٰ تقریباً انیسویں صدی کے آخر تک بے خبر تھے۔ اس لیے اگر ”کر بل کھا“ کو اس کے مؤلف کے دھوے کی روشنی میں ایک عرصے تک اردو کی پہلی نثری تالیف کہا جاتا رہا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ ابتدائے عہد محمد شاہی میں شمال والے دکن کی شعری روایت سے جو کسی حد تک باخبر تھے اور دی و کھنی کے پُر تاثیر کلام کے زیر اثر انہوں نے اردو میں تخلیقی شعری کو ایک تحریک کی صورت بھی دی، لیکن نثر کے معاملے میں اس قسم کے اثرات کی کوئی نشاندہی ہمیں نہیں ملتی۔ اس لیے غالب تک اردو نثر کا جو ارتقا فی سلسلہ شمالی ہند میں ملتا ہے اس کی ابتدا ”کر بل کھا“ ہی سے ہوئی، جس کے مؤلف کا یہ دھوئی اس اعتبار سے قابل لحاظ ہے:

”پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوئے مستمع“

کر بل کھا جن حالات اور تحہ نصوص کے تحت لکھی گئی، ان کا ذکر فضل نے اپنے دیباچہ

میں کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کرمل کٹھا کی تالیف کسی ادبی یا علمی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ عوامی تقاضے کے تحت ہوئی۔ یہ عوامی تقاضا تاریخی لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ کرمل کٹھا کی تالیف ۱۱۳۵ھ میں اور اس پر نظر ثانی ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ یہ محمد شاہی دور تھا۔ اس دور میں اردو بڑی تیزی سے فارسی کی جگہ لے رہی تھی۔ اردو شاعری کا چرچا عام ہو چکا تھا۔ اردو نثر کی طرف ابھی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ علمی اور مجلسی اعلیٰ ہار کی زبان فارسی تھی۔ اس ماحول میں محرم کی مجلس میں کم بخت سے نکسے یا آن بڑھ عوام (خصوصاً محروموں) کی طرف سے یہ تقاضا ”کہ صد حیف و ہزار غسوس جو ہم کم نصیب عبادت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے محروم رہتے۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہودے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھا دے اور ہم سے بے گتھوں کو سمجھا کر دلا دے“ (دیباچہ کرمل کٹھا)

کرمل کٹھا کی زبان اردو نثری اسلوب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس دور کی اس ادبی اور لسانی تحریک کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے جو دلی کے دیوان کے شمالی ہند میں پکپکنے کے بعد شروع ہوئی۔ مرزا مظہر جان جانا اور خان آرزو اس تحریک کے سرپرست تھے۔ اردو زبان کو مرکز سلطنت کے ادبی مذاق کی روشنی میں صاف و شستہ بنانے کا کام اس عہد میں شروع ہوا۔ دلی کے روزمرے اور محاورے کو ترجیح دی جانے لگی اور دوسرے علاقوں (دکن، برہمچ اور پنجاب) کے اثرات کو ختم کیا جانے لگا۔ اصلاح زبان کا یہ عمل جو ۱۱۵۵ھ کے لگ بھگ شروع ہوا، مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا، ناخ تک پہنچا، جن کی ادبی یا لسانی تحریک سے غالب بھی متاثر تھے۔

کرمل کٹھا سے لے کر فورٹ ولیم کالج کی نثری کاوشوں تک اسالیب بیان کے اعتبار سے ہمیں دو طرز ملتے ہیں۔ ایک طرز تو فارسی کے تتبع میں بڑے تکلف نثر کا ہے جس کے اہم نمائندے عطاء حسین، حسین مرصع رقم (مؤلف نو طرز مرصع) تھے۔ دوسرا طرز سادہ و سُرکا ہے جس میں ادائے مطلب کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ ”کرمل کٹھا“ اسی زمرے میں آتی ہے۔ اس کے مؤلف نے جس عوامی ضرورت کے تحت روضۃ المشہد کے فارسی غلامے سے یہ کتاب ترجمہ کی، اس کا تقاضا یہی تھا کہ اسے عام فہم بنایا جائے۔ اس لیے اس کتاب کا اسلوب (دیباچہ کو چھوڑ کر) سادہ ہے۔ لیکن اس سادگی میں وہ مسافتی اور سطحی ابھی پیدا نہیں ہوئی جو پچاس برس بعد کی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ شاعری کے مقابلے میں اردو نثر کا اسلوب ذرا آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس

اردو کی نثر میں اصلاح زبان کی کوششوں کو بھی مد نظر رکھا جائے تو جس سادہ و سلیس نثر کے نمونے فورٹ ولیم کالج کی نگارشات میں نظر آتے ہیں وہ دفعتاً پیدا نہیں ہو گئے۔ بلکہ کرل کتھا کے بعد پُر کلف نثر کے ساتھ ساتھ سادہ نثر بھی نکلی جاری تھی۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن مجید اور شاہ عالم دہانی کی مجاہد القصص سادگی اور عام فہمی کی اس روش کے نمونے ہیں۔ تاہم فورٹ ولیم کالج کی نثری نگارشات کی یہ تاریخی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اس کالج کے منتظمین نے دہلی نثریوں سے اپنی خاص ضرورت کے تحت سادہ، سلیس اور بول چال کے قریب زبان نکھوا کر اردو کے نثری اسلوب کو متعین کرنے کی تبلیغ کوشش کی۔

فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر کا جو کام ہوا وہ ایک سیاسی تقاضے کے تحت تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا تھا۔ تاریخ کا فیصلہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ انتقال اقتدار سے قبل جن دستوری مرحلوں کو طے کرنا ضروری تھا ان میں زبان کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ مظلوموں کی دفتری زبان فارسی تھی۔ نئے دفتری نظام کے لیے زبان کی تبدیلی سیاسی لحاظ سے از بس ضروری تھی۔ فارسی کی جگہ فی الفور انگریزی نہیں لے سکتی تھی۔ انتظامی لحاظ سے بھی اور انتظامی اعتبار سے بھی اس موقع پر انگریزی کو لا ب استعمال تھا۔ انگریزوں میں سلاطین اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جس کو ملک میں اینگلو فرینک کا درجہ حاصل تھا اور اس وقت کی تبدیلی کے لیے یہی زبان سوزوں تر تھی۔ چنانچہ جو تجربہ فورٹ ولیم کالج میں ہوا اس کے نتائج کچھ عرصہ بعد دفتری زبان کی تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ ۱۸۳۲ء میں دفتری زبان اردو ہو گئی۔ اسی زمانے میں اردو اخبار بھی نکلتے گئے۔ مذہبی تبلیغ کے لیے بھی اردو سے کام لیا جانے لگا۔ اگرچہ مستقبل کے دفتری تقاضوں کے لیے ۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم بنادی گئی تاہم دہلی کالج میں اردو ہی ذریعہ تعلیم رہی اور اس کالج کی تعلیمی و نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دہلی اور کلکتہ کے مسلمانوں سے سہائی قائم ہوئی۔ اردو نثر کے فروغ کا یہ نقطہ ارتقا غالب کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

فورٹ ولیم کالج سے دہلی کالج تک اردو نثر کے اس فروغ و ترقی کے ماحول میں ادبی نقطہ نظر سے جہاں فورٹ ولیم کالج کی روش پر سادہ و سلیس نثر میں داستانیں ادب تالیف و ترجمہ ہوا،

وہاں کمسنو کا تکلف پسند راجان بھی داستانوں میں نظر آتا ہے۔ اس راجان کے لہجہ سے درجہ ب علی بیگ سرور (مؤلف فسانہ عجائب) تھے جن کی ایک تصنیف 'پہ غالب نے تقریباً لکھی ہے۔ سادگی اور تکلف کے یہ دونوں سلسلے مرزا غالب کی نثر نگاری تک اپنے اپنے مطلقوں میں قبول عام کا درجہ رکھتے تھے۔ خصوصاً داستانوں کا راجان عام ہو رہا تھا۔ داستانیں لکھی بھی جاتی تھیں۔ ان کو پڑھا بھی جاتا تھا اور سنایا بھی جاتا تھا۔ مٹا کر سے کی طرح داستان گوئی ایک تہذیبی ادارے کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ غالب کو بھی داستانوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ شراب کی پوٹلیں اور ضخیم داستانیں ان کا دل پسند مشغلہ تھیں۔ فروغ اردو کے اس ماحول میں غالب بھی بعض ضرورتوں اور مجبوروں کے تحت اردو نثر (مخلوط نگاری) کی طرف مائل ہوئے اور پھر کچھ ضرورت یا مجبوری کچھ عرصہ بعد ایک عادت بن کر ان کے لیے راحت و دلچسپی کا ذریعہ بن گئی۔ اس طرح تاریخ نے اردو نثر کو ایک ایسا صاحب طرز ادیب دیا جس نے اپنے انداز خاص میں اردو نثر کے غالب میں نئی روح پھونکی۔

جہاں تک اسلوب کے خارجی محاسن کا تعلق ہے غالب کے زمانے تک اردو نثر قربات کی مختلف منزلوں سے گزر چکی تھی۔ اس میں مطلق اور تنہا اسلوب تھا تو سادہ و سلیس اسلوب بھی تھا۔ اس میں لکھنو کی پُر تکلف صنعت گری تھی تو دہلی کا روز مرہ اور محاورہ بھی موجود تھا۔ لیکن ان مختلف اسالیب بیان کے اندر جہاں تک کسی شخصیت کی جھلک کا تعلق ہے وہ اس وقت تک منفرد تھی۔ شخصی اسلوب، جس میں کسی شخصیت کے دل کی دھڑکتیں، فکر و احساس کی لہریں اور جذب و شوق کے سلسلے سمائے ہوئے ہوتے ہیں، آسانی سے پیدا نہیں ہو جاتا۔ یہ نہ ریاض کا شعر ہے نہ اتفاق کی بات۔ یہ تو ایک عطیہ قدرت ہے، جسے مل جائے، مل جائے۔ زبان اپنے ذخیرہ لفظی سمیت موجود ہوتی ہے۔ صرف و نحو کے قواعد بھی مستحکم ہو جاتے ہیں۔ لیکن انہی لفظوں اور قاعدوں کے بے ساختہ استعمال میں جب کوئی اہل قلم اپنی شخصیت کو بھی سمودتا ہے تو شخص اسلوب ظہور میں آتا ہے۔ یہ مرحلہ اردو نثر میں غالب کی نثر کے ساتھ آیا۔ یہاں سے اردو نثر میں تخلیقی ادب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور مختلف اصناف ادب کے لیے اسلوب کی بنیاد مہیا ہوتی ہے۔

اردو نثر میں غالب کا سرمایہ زیادہ تر ان کے خطوط ہیں۔ خطوط کے کچھ مجموعے ان کی زندگی ہی میں چھپنا شروع ہو گئے تھے (عمومیت کی وفات سے چار ماہ پہلے اور اردو سے متعلق حصہ اول وفات کے ایک ماہ بعد طبع و شائع ہوئے)۔ خطوط کے کچھ مجموعے (اردو سے متعلق، حصہ دوم، میکسیم غالب اور ادارت غالب) بہت بعد میں طبع ہوئے۔ خطوط کے علاوہ غالب نے کچھ تقریظیں، ویبیاچے اور رسالے لکھے ہیں۔ رسائل میں نکات غالب (مطبوعہ ۱۸۹۶ء)، لطائف لطیفی (مطبوعہ ۱۸۹۶ء) تنقیر (مطبوعہ ۱۸۹۶ء)، نامے غالب، سوالات عبدالمکریم قاضی ذکر ہیں۔ تقریظیں بہادر شاہ ثانی اور رجب علی بیگ سردر کی تالیفات پر اور ویبیاچے انتخاب غالب، خاش و خاش، دلچ ان سخن اور قصائد مرزا کلب حسین خاں پر لکھے گئے۔ ان نثری نگارشات کے اسلوب کا جائزہ لینے سے پہلے ان حالات یا مجبوریوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن کے تحت غالب نے فارسی کو چھوڑ کر اردو میں تحریریں لکھنی شروع کیں۔

اردو نثر نگاری سے پہلے غالب ایک مدت تک فارسی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تھے۔ [ان کے فارسی خطوط ”بیچ آہنگ“ کے مجموعے میں پیچھے] ہر چند کہ اس زمانے میں اردو کا کھلنا اثر خاصہ وسیع ہو چکا تھا لیکن اہل فضل و کمال ابھی تک اپنی علمی کاوشوں کے اظہار کے لیے فارسی کا رامن تھا۔ ہوئے تھے۔ پھر غالب کہ جنہوں نے اپنی فارسی دانگی پر بڑا ناز تھا، اس راہ رویش کو کیونکر چھوڑ سکتے تھے۔ فارسی میں علمی و ادبی اظہار بالعموم سید حساس اور بے تکلفانہ نہیں تھا۔ فارسی یہاں کے لوگوں کی فطری زبان بھی نہیں تھی کہ جیسے بے ساختہ طور پر لکھا جاسکتا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فارسی میں انشا نگاری کے لیے محنت و کاوش کی ضرورت تھی۔ یہ محنت و کاوش انسان اسی وقت تک کر سکتا ہے جب اس کے قوائے جسمانی میں توانائی ہوتی ہے۔ قوتی میں اضمحلال کے ساتھ صناعی کے انداز مجبوراً سمجھ جاتے ہیں۔ انسان سیدھے سادے انداز میں بے تکلفی سے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کو قیمت سمجھتا ہے۔ اس بے تکلفانہ اظہار مطلب کے لیے ہمیشہ وہ زبان کام آتی ہے جو انسان کی سمجھ میں پڑی ہوتی ہے اور جسے وہ شب و روز عام کاروبار زندگی میں بولتا چلتا ہے۔ غالب کی اردو خطوط نوہیسی کا آغاز (موجودہ خطوط کی روشنی میں) مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا، جب ان کی عمر پچاس سال سے تجاوز تھی۔ حیاست انسانانی میں یہ منزل ہے جب آفتاب

عمرز مٹنے لگا ہے اور قوی میں اضطلال شروع ہو جاتا ہے۔ مولانا حالی نے قلمِ مٹنے کے تعلق اور مصروفیات کو اردو خطوط نویسی کا باعث قرار دیا ہے۔ یہ ایک اضافی سبب ہو سکتا ہے۔ بنیادی سبب طبیعی ہی تھا۔ بڑے تکلف قاری تحریروں اور بے تکلف اردو تحریروں کے سلسلے میں خود غالب کا یہ بیان زیادہ موقع ہے جہاں ہوں نے عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

”بندہ نواز قاری میں خطوں کا کھٹنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرائے سری و ضعف کے صد سوں سے محنت پڑوئی جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔“

(خطوط غالب، از مہر، ص ۵۲۷)

یعنی قاری عبارت کے شکوہ کو قائم رکھنے کے لیے ”محنت پڑوئی اور جگر کاوی“ کی ضرورت تھی اور یہ طاقت اب ان میں نہیں رہی تھی۔ اس لیے وہ سیدھی سادی اور فطری زبان میں خط لکھتے پر مجبور تھے۔ انہی سیدھی سادی اور بے تکلف تحریروں کو جب غالب کے اصحاب اور شاگردوں نے چھاپنا چاہا تو انہوں نے اس امر کا بچی سنخوری کے شکوہ کے منافی سمجھا:

”اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہو گا کہ میں نے قلم سنبھال کر لکھ کر لکھا ہو گا۔ ورنہ تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سنخوری کے شکوہ کے منافی ہے۔“

(خطایام غشی شیونرائن آرام بکرہ ۱۸۵۸ء، نو مبر ۱۸۵۸ء)

لیکن یہی ”تحریر سرسری“ درحقیقت وہ فطری تحریر تھی جس میں غالب کے جذبات و احساسات بے ساختہ طور پر ظہور پذیر ہوئے تھے۔ شروع میں خود انہیں اس کے فنی حسن کا اعتبار نہ آیا تھا لیکن پلاخرہ یہی اسلوب تحریر غالب کا انداز خاص بن کر اردو نثر کی رفتار ترقی پر اثر انداز ہوا۔

غالب انشاء پر وازی کے سرعہ و اسالیب سے بخوبی آگاہ تھے اور انہوں نے اپنی قاری تحریروں میں ان اسالیب کی پیروی بھی کی ہے۔ چودھری عبدالغفور سرور اور صاحب عالم مارہروی کے خطوط میں غالب نے ان اسالیب کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ایک خط میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بندہ کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے: مٹھی، قافیہ ہے اور وزن نہیں، ہر جز نوزن

ہے اور کافی نہیں! عاری: نہ وزن ہے، نہ قافیہ۔ مسلج: مسطح ہے کہ دونوں فقرہوں میں الفاظ ملائم اور مناسب نہ مل سکیں۔ قلم میں یہ صنعت آج سے تو اس کو مریض کہتے ہیں اور نثر اس صنعت پر مشکل ہو تو اس کو مسلج کہتے ہیں۔ اس قاعدہ کو عبدالمزاق بدل سکتا ہے نہ صاحب قلم مفلوج نہ نہ یہ قفر آئے سرہ پا۔“

[خط نمبر ۱۸۵۹ع۔ خطوط غالب از میر، صفحہ ۴۸۶]

غالب نے سیدھی سادی نثر میں خط لکھنے تو شروع کر دیے تھے لیکن اردو کی یہ نثری تحریریں ابھی ان کے نزدیک مرہبہ اسلوب سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے قابل قدر نہیں تھیں۔ اردو میں ان اسالیب کی پیروی ان کے خیال میں مشکل تھی۔ علمی و ادبی تحریروں کے لیے وہ عبارت آرائی کو (جو روایتی اسلوب کا خاصہ تھی) ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ناظم تعلیم صوبہات احمد مسٹر ریٹ نے ان سے اردو نثر کی فرمائش کی تو وہ حنفیہ مذہب تھے کہ کس حکایت یا روایت کو فارسی سے اردو میں منتقل کریں۔ نیز اس کا اسلوب کیا ہو:

”جناب ریٹ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ نہیں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا، میرا اردو بہ نسبت اوروں کے اردو کے فصیح ہوگا۔“

[خط نام میر سیدی مجروح، خطوط غالب، صفحہ ۲۵۲، ۲۵۳]

اس سے ظاہر ہے کہ خطوط سے قطع نظر ابھی وہ علمی و ادبی نگارشات کے لیے اردو کو خام مانتے تھے۔ کیونکہ ان کا اندیشہ پروازی کا تصور فارسی کے تابع تھا جس میں قوت تخیل کی کار فرمائی ضروری تھی۔ بہر حال یہ ظلم ہلا خفوت کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ غالب کو اپنے اس اسلوب کی قدرت اور انفرادیت کا احساس ہوا جسے انہوں نے بے تکلف تحریروں کے لیے اختیار کیا تھا۔ یہ وہ اسلوب تھا جو فارسی کے مرہبہ اسالیب کی پیروی سے آزا اور چند بات و احساسات کی بے ساختہ لہر کے تابع تھا۔ تاہم یہ اسلوب صرف خطوط کے لیے تھا تقریباتوں اور بیجاہوں کے لیے عبارت آرائی کا وہی عمل جاری رہا۔ بعض اوقات یہ عبارت آرائی اتنی رکی ہوئی ہے کہ اسے کسی خاص تصنیف سے تعلق نہیں کیا جاسکتا۔ بعض عبارتوں میں تو ہر جگہ بھرا ہے۔ مثلاً تقریباً ہر کتاب بہادر

شایدانی اور خاتر شعاع مہر کی یہ عبارت ایک آدھ لفظی تبدیلی کے سوا بالکل ایک ہی ہے:

”مسائل حکیمانہ کی حقیقی و ترہات مدنیات کی مستحق، درود و دریاں کے مدح و عروج کا اعجاز، افسانہ و انیسوں کے مقاصد کا مدار، شکر و شکایت کا عنوان، نظم و نثر میں آفرین کا بیان، درود قبول کی حکایت، فتح و شکست کی روایت، صرف و نحو کی رازدانی، لفظ و معنی (نثر و نظم) کی گھنٹھانی، جو کچھ انگوٹوں نے کہا ہے، جو کچھ اب کوئی کہہ رہا ہے، جو کچھ آگے کہیں گے اور قیامت تک کہتے رہیں گے، جو کچھ حقائق، نیک، بد، اور کھن سے ہے، سب دلائل و نطقِ حق سے ہے۔“

اب سمجھیے کہ سخن از دروے مثل کیا ہے؟ چشمہ ہے؟ ندی ہے؟ سِل ہے؟ دریا ہے؟ کہیں روانی ہے؟ کس زور کا پانی ہے؟ اس کا چر حواء، اس کی رفتار، اس پر کس کا زور، کس کا اختیار؟ جدھر منہ کیا، اُدھر ایک نالہ بہاؤ یا دریا کی لہر کیا گھوڑے کی جاگ ہے کہ کسی کے بات ہو؟“

علمی اور ادبی تصانیف کے اسلوب پر بھی غالب کی نظر رہتی ہے جس کا ذکر ان کتب پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کیا ہے۔ مثلاً دیباچہ سراج المعرفۃ فی السیدۃ رحمت علی خاں میں اس کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اس رسالے کی تحریر میں دو عبارت آرد کہ صاف اور بے تکلف ہو، خرچ کریں۔“

داستان جو سنانے کی چیز ہے، اس کا اسلوب علمی تصنیف کے تحریری اسلوب کے مقابلے میں بول چال کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ چنانچہ غلامِ امان کی داستان پر تبصرہ کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں:

”عبارت آدھائی کو ترک کیا ہے، گویا تقریر کو پیرایہ تحریر دیا ہے۔“

بعض علمی مسائل کی بحث کے سلسلے میں غالب نے جو مسائل یا خطوط لکھے ہیں، ان کا پیرایہ بیان سادہ، درواں اور منطقی ہے۔ مثلاً نالہ غالب کا اسلوب، اس میں چند بات بھی ہیں لیکن طرزِ بیان سادہ اور مدلل ہے۔ کہیں کہیں قوافی کا اخترا م بھی ہے لیکن زیادہ تر قافیے بے ساختہ ہیں۔ چونکہ یہ رسالہ خط کی شکل میں لکھا گیا ہے اس لیے گفتگو اور مکالمے کی صورت بھی کہیں کہیں موجود ہے۔

لیکن اردو نثر میں مرزا غالب کا کارنامہ خاص خطوط ہی ہیں، جن میں وہ مطلب نوکری

(۱) خطوط غالب، جلد ۱، صفحہ ۶۳۶

(۲) خطوط غالب، جلد ۱، صفحہ ۶۳۸

(۳) خطوط غالب، جلد ۱، صفحہ ۶۳۸

کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ خط کا اصل مقصد بھی ادائے مطلب ہی ہوتا ہے۔ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ جن کا رد و باری امور اور معاملات کی خاطر خط کو ذریعہ اظہار بناتے ہیں، ان کا بنیادی تقاضا یہی ہے۔ غالب کی اردو خطوط انویسی بھی چونکہ انہی امور و معاملات کی خاطر شروع ہوئی تھی، اس لیے خطوط کے اسلوب میں سادگی کے ساتھ ادائے مطلب کو ہر بات پر فوقیت حاصل ہے۔ غالب نے ”سچ آج تک“ کے دیباچے میں بھی خطوط انویسی کے رسمی انداز پر کڑی تنقید کی ہے:

”کچھ بھی اس روش از شیوہ غالب مستمند نہ چنداں است کہ یک لفظ نیاز داشت باشد و اور اشخاص دانند کہ بنیاد میں در نگارش ایں است کہ چون کلمہ و در قیافہ گیرم مکتوب الیہ را بلطفتی کہ فرما طور حالت اوست، و در سر آواز صنف آواز و ہم و در حرف و سجع مدعا گردم۔ القاب و آداب و تلخیص بہت گوئی و عافیت جوئی حشو زائد است و لفظ کثرت حشو را و فتح نہند“۔

غالب نے خطوط انویسی کے اس رسمی انداز کو ”عمر شای روشیں“ کہہ کر اس کی سخت مذمت کی ہے اور احباب کو یہ روش ترک کرنے اور اس انداز کو اختیار کرنے کا بالواسطہ مشورہ دیا ہے جس کے وہ خود پائی اور سوچتے تھے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں چاہا اس انداز خاص کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ مثلاً:

”ہاں صاحب، کیا چاہتے ہو؟ مجتہد امیر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا، اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں، میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دعاغل چل گیا ہے۔ لکھنے کو کرید اگر وہ مسودہ کو بار بار دیکھا کرو، پاؤں کے کیا؟ یعنی تم کو وہ مجھ شای روشیں پسند ہیں!“ یہاں خبریت ہے، دہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ قلمتھارا بہت دنوں کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ ہر طور دار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا اور دہاں حکیم میر اشرف علی اور میر انیس علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو“۔

کہیں، کچھ کہو، انگوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور؟ ہائے، کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھوں، وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہے آج ہے، امیر بے باراں ہے، نکل

بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو، تم جانتے ہو، ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ لیا، زندہ کا وقت ہے، موقوف رکھا۔ اور اگر حمایتی خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی سارا سبب تین سطریں دیکھی بھی میں نے لکھ دیں۔“

[خط نام بھر مہدی بخروج، ۱۹ مئی ۱۸۶۲ء، خطوط غالب، صفحہ ۳۰۸]

”جواب لکھنے میں جو میری طرف سے قصور ہوتا ہے، اس کے دو سبب ہیں: ایک تو یہ کہ حضرت مینا بھر میں نوپے لکھتے ہیں۔ نہیں کہاں تک یاد رکھا کروں؟ ایک مکان ہو تو لکھ رکھوں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں اور کیا لکھوں؟ میں نے آئین نامہ بخاری چھوڑ کر مطلب نوٹسکی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں؟“

[خط نام قاضی عبدالکبیر، جنوری ۹، ربیع الاول ۱۲۷۲ھ، ۲۹ نومبر ۱۸۵۵ء، صفحہ ۵۲۰]

مطلب نوٹسکی کے سلسلے میں جہاں غالب خود اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ تک ان کی بات پوری طرح پہنچ جائے اور درمیان میں کوئی ابہام نہ رہ جائے، وہاں وہ دوسروں سے بھی اسی وضاحت و صراحت کی توقع رکھتے ہیں۔ چنانچہ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”بھائی میرے سر کی قسم، اس خط کا جواب ضرور لکھنا اور ایسا واضح لکھنا کہ مجھ کو سمجھ سکوں ورنہ ابھی طرح اس کو سمجھ لے۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۳۲۹]

غالب نے اردو نثر نگاری اس وقت شروع کی تھی جب ان کی اولیٰ شخصیت اوج کمال تک پہنچ چکی تھی۔ اس لیے اس سلسلہ مطلب نوٹسکی میں بھی ان کی سنجھی ہوئی اولیٰ شخصیت آخر بُد کاری کا ایک انداز نکال لیتی ہے، بلکہ پھر وہ اس سادہ دہے کار انداز میں بڑی دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے واقعہ انقلاب کا غالب کی خطوط نوٹسکی پر گہرا اثر پڑا۔

یہ وہ بُد آشوب دور تھا جب دہلی پر آلام و مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر دارہ امیر غازی قبضہ ہوا تو مسلمانوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ غالب بوجہ

دہلی ہی میں رہے۔ لیکن دہلی کے جرنے کا ان کی مجلس زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ جن دوستوں سے شب و روز ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مسائل روزمرہ پر گفتگو نہیں ہوتی تھیں۔ نئی ذوقی معاملات پر راز و نیاز کی باتیں ہوتی تھیں۔ وہ سب ادھر ادھر بکھر گئے۔ حالات معمول پر آنے کے بعد ڈاک کا انتظام بحال ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں کی آبادی اور مجلس زندگی کی بحالی کئی سال تک نہ ہو سکی۔ اس مجلسی غلام کو کٹر کرنے اور ویرانہ دل کو آباد کرنے کا اب صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا مکتوب نگاری غالب کے لیے یہ سہارا ایک فہرست عزیز ترین گیا۔ دہلی دل کے تلخ احساس اور اس کے مداوے کی چند مثالیں دیکھئے:

”کیوں صاحب! مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج صہیہ بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاہاب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔“

[خط نام فتنہ، لکاشہ شب ۱۹ جون ۱۸۵۸ ع]

”کیوں صاحب، دُور سے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں مننے تو روٹھنے کی وجہ تو کھسو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھر سے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا نہیں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جواب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہر کارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب؟ دس دس دن بارہ بارہ دن سے حمسا مارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب، نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بھل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو ہر تک بھیجو۔“

[خط نام فتنہ، سوموار ۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ ع]

”مارڈالیا دتیری جراب بھلی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا نہ ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و گوشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا

(۱) اس کی تفصیل غالب نے اپنے خط نام فتنہ بر گوپال فتنہ (مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷) میں لکھی ہے (خطوط غالب، ص ۱۵۵)

ایک جگہ فراہم ہو کر بس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا (اے) ^۱ شک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک سحر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

”کل سے مجھ کو خواجہ میکش بہت یاد آتا ہے۔“ سو صاحب اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا
لکھوں؟ وہ مجھتیں اور تقریریں جویا کرتے ہو مارتو کچھ میں نہیں آتی۔ مجھ سے خط پر خط
لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے جاس نہیں نکلتی، یہ تحریر سٹانی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔
بہر حال کچھ لکھتا ہوں۔ دیکھو، کیا لکھتا ہوں۔

[نام میر مہدی مجروح، ۱۰ اپریل ۱۹۵۹ء]

”نور چشم، راحت جان، میر سر فراز حسین جیتے رہو۔ تمہارے دستخطی خط لے میرے ساتھ
وہ کیا، جوئے بچہ کن نے بیوقوف کے ساتھ کیا۔ میاں، یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان
ہیں، تو انا ہیں یا تو اس ہیں، بڑے پیش قیمت ہیں، یعنی بہر حال قیمت ہیں۔ کوئی غلام
نکھتا کہتا ہے:

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا زمانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ ہے اور وہی نہیں ہوں۔ میر جیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف
میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خان آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا،
چھڑائے ہوؤں میں سے کچھ گئے ہیں۔ اللہ، اللہ، اللہ، ہزاروں کا نہیں ماتم دار ہوں۔
میں مردوں کا تو مجھ کو کون روئے گا۔ منو غالب مددنا بیٹنا کیسا۔ کچھ اشتہار کی باتیں کرو کہ
میر سر فراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھواؤ اور میرن صاحب کو بلاؤ۔

[نام میر سر فراز حسین۔ خطوط غالب، صفحہ ۳۴۰]

چنانچہ واقعہ انقلاب کے بعد غالب کی خطوط نویسی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اب خطوط صرف

(۱) سلیم خط میں ”ایک“۔ دہلی میں ”کے“۔

ادائے مطلب ہی کا ذریعہ نہیں رہے۔ بلکہ مجلسی راز و نیاز کا وسیلہ بھی بن جاتے ہیں۔ اس میں جذبات و احساسات بھی ہوتے ہیں اور تصورات و خیالات بھی۔ واقعہ نگاری بھی ہوتی ہے اور مرتع کشی بھی۔ اور یہی وہ عناصر ہیں جو خطوط کو کاروباری سطح سے بلند کر کے ان کو ادب کے دائرے میں لے آتے ہیں۔ ادب کی یہ وہ خاموش فضا ہے جہاں احباب کی ملاقات ہوتی ہے۔ خط کو عام طور پر نصف ملاقات کا مترادف کہا جاتا ہے لیکن اس خاموش فضا میں پہنچ کر خط کبھی کبھی پوری ملاقات بلکہ اس سے بھی کچھ اندر بن جاتا ہے۔ اسلئے کہ جو باتیں انسان بالمشاورہ گفتگو میں بھی نہیں کہہ پاتا وہ خط میں کہہ گزرتا ہے۔ خطوط نگاری کا یہ دنیا انداز تھا جو واقعہ انتخاب کے بعد تہائی کی خاموش فضا میں پیدا ہوا۔ یہ انداز غالب کے شاگردوں اور دوستوں کے لئے ایک اصول تھا تھا۔ بعض عزیزوں نے یہ سوچا کہ یہ جنس خاص اگر عام ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ وقت اور آرام نے ان خطوط کی اشاعت کے لئے غالب سے اجازت طلب کی۔ غالب نے سختی سے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ لیکن اب قدرتی طور پر انہیں بھی اپنے شیوہ خاص کی انفرادیت کا احساس ہونے لگا اور وہ اس پر اظہارِ فخر بھی کرنے لگے۔ اپنے کئی خطوط میں غالب نے اپنے انداز نگارش کی خصوصیات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

”کاشات دل کے ماہ دو ہفتہ غشی ہر کو پال تفتِ تجری میں کیا کیا بحر طرازیں کرتے ہیں۔
اب ضرور آج اسے کہ ہم بھی جواب ہی انداز سے نکلیں۔“

[لکھنؤ جمعہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء، خطوط غالب، ص ۱۳۵]

”بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کوہے مکالمہ ہے۔“

[خط بنام تفت، جمعہ ۱۸ ستمبر ۱۸۵۸ء، خطوط غالب، ص ۱۷۱]

”تم سمجھے؟ میں تمہارے اور فشی می بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمہارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تقریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو کہ مکالمہ کیوں متوقف ہے؟ اور کیا دینے ہے۔“ وہاں کیا ہو رہا ہے؟“

[خاتم تفت، ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء، خطوط غالب، ص ۱۷۳]

”مطالب اور مقاصد تمام ہوئے اور ہم تم بزبان قلم پاؤ گرام کلام ہوئے۔“

[تمام مرزا حاتم علی بیگ میر ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ ع، خطوط غالب ص ۲۴۲]

”مرزا صاحب، ہمیں نے وہ اٹھاؤ تو خرید لیا اور کیا ہے کہ مرزا سلو کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزاروں سے بزبان قلم کیا کریں۔ ہجر میں دو سال کے مزے لیا کرو۔“

[تمام حاتم علی بیگ میر خطوط غالب ص ۲۴۲]

”بھائی مجھ کو اس مصیبت میں کیا قسمی آتی ہے کہ ہم تم اور مرزا اقتدار میں مراسلت و مکالمہ ہو گئی ہے روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر لوجات لگانے پنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لگانے بھاؤں گا۔ قسمت ہے کہ حصول آدھا آدھا نہ ہے ورنہ باتیں کرنے کا مزہ معلوم ہوتا۔“

[تمام ٹٹنی نئی بخش حقیر، چہار شنبہ ۱۲ ستمبر ۱۸۵۸ ع]

”واوہ اسید صاحب، تم بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے، مٹر میں خود نمایاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں مگر جائزے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو پہ سبب اب کے دوسری نہیں تو ہمیں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے، مگر حیران ہوں کہ کیا تحریر سازی کروں۔ بھائی تم اردو کے مرزا قلیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نمبر کے کنارے رہتے رہتے رو دیکھ بن گئے ہو۔ کیا قلیل کیا رو دیکھ بن گئے ہو۔ یہ سب قسمی کی باتیں ہیں۔ لوسنوا اب تمھاری دینی کی باتیں کرتے ہیں۔“

[تمام میر مہدی بخروج، بدھ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۸ ع]

”میر مہدی جیسے رہو، آفرین، صد ہزار آفرین۔ اردو عبارت لکھنے کا اچھا دستک پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سنو مدلی کے تمام مال و متاع و زور کو ہری ٹوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ مرزا عبارت خاص میری دولت قسمی سوا ایک خالم پانی پتی، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا ٹوٹ لے گیا۔ مگر ہمیں نے اس کو کھل کیا۔ اللہ برکت دے۔“

[تمام میر مہدی بخروج، ۷ مارچ ۱۸۵۹ ع]

غالب کا یہ انداز خاص جو واقعہ انقلاب سے پہلے بعض خطوط میں (خصوصاً جو وقت کے نام لکھے گئے) جھلکتا تھا، انقلاب کے بعد قریبی احباب کے خطوط میں ان کا شیوہ خاص بن گیا۔ تاہم حامیانہ (کاروباری) اور ادبیانہ تحریر کا فرق ان کے پیش نظر ضرور رہا۔ جب ان کے خطوط زیر طباعت تھے تو انہوں نے خواہ مخواہ غلام ٹھٹھہ کو (جن کے زیر اہتمام یہ خطوط چھپ رہے تھے) اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا:

”فرض کہ حامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں، یہ لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں ہے؟ یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود رد کر دیں گے۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۲۵۵]

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو غالب کے خطوط میں اسالیب میان کا خاصا جھوج ہے۔ اسالیب کے اس جھوج میں غالب کی شوخ اور بذلہ سخا شخصیت کی ہنسکت تو ہر جگہ موجود ہے۔ البتہ جن احباب سے زیادہ مگر سے اور بے لطفانہ مراسم ہیں، ان کے نام خطوط میں یہ کیفیات زیادہ نمایاں ہیں۔ غالب جھوم غم عالم میں زندگی سے نہاؤ کے لئے زندہ دلی اور گفتہ سرائی کو ضروری سمجھتے تھے۔ یہ جوہر ان کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھا اور مرتے دم تک ساتھ رہا۔ زندہ دلی کا یہی احساس دواسپے احباب میں بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے خطوط کو ذریعہ بنایا تھا۔ اس غایت کے نتیجے میں غالب کا ادبی اسلوب گونا گوں محاسن کا حامل بنا ہے۔ بعض خطوط جن میں غالب نے اپنی ذاتی کیفیات اور قلبی واردات کے مرتفعے پیش کئے ہیں، وہاں اکل بانسانے اور انشائیے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً علاء الدین علانی کے نام خط نشان ۹ (صفحہ ۶۹، خطوط غالب)، نشان ۲۲ (ص ۸۷-۸۹)، قربان علی بیگ ساک کے نام خط نشان ۱ (صفحہ ۱۱۹)، ہر گوبال نقوی کے نام خط نشان ۷ (ص ۱۳۵)، نشان ۲۸ (صفحہ ۱۵۴) نشان ۶۰ (ص ۱۷۸) حاتم علی بیگ مہر کے نام خط نشان ۱۷، ۱۹، ۲۰ (ص ۲۳۳-۲۳۷)، میر مہدی مجروح کے نام خط نشان ۹ (ص ۲۸۰-۲۸۱) نشان ۲۱ (ص ۲۹۳، غیرہ وغیرہ)۔

غالب نے اپنے بعض خطوط میں باتیں کرنے اور خبریں سنانے کا جو انداز اختیار کیا ہے، اس سے

ان کے اسلوب میں بیان نگاری، مرتق نگاری اور مکالمہ نگاری کی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ واقعات و حالات کے بیان میں فقرے چمکے چمکے، مسلسل اور دواں ہوتے ہیں۔ ماحول کی تصویریں غائب کرتے ہوئے بعض معمولی معمولی جزئیات وہ اس خوبی سے پیش کر جاتے ہیں کہ جیسے جہاں ماحول مکتوب الیہ اور قاری کے سامنے آ جاتا ہے۔ گفتگو کا انداز اور مکالمے ان مرتقوں کو متحرک بنا دیتے ہیں۔ اردو نثر میں مختصر افسانے مانٹا بیٹے اور ڈرامے کی اصناف غالب کے بعد قائم ہو گئی ہیں۔ لیکن ان اصناف ادب کے لئے اسالیب بیان کے نمونے غالب کے خطوط میں ملتے ہیں اور یہ نمونے اسے حقیقی اور جاندار ہیں کہ افسانے مانٹا بیٹے اور ڈرامے سے زیادہ لطف و کیف کے حامل ہیں۔ مکالمہ نگاری کے سلسلے میں مندرجہ ذیل خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں: خط ہمام علاؤ الدین علی بن عثمان ۸ (مس ۶۹)، عثمان ۲۳ (مس ۹۱) میر مہدی بخروج کے نام خط عثمان ۲۳ (مس ۳۰۲)۔ ۳۰۳ (نواب یوسف مرزا کے نام خط عثمان ۱) (مس ۳۰۴) وغیرہ

غالب اپنے بعض خطوط میں ادبی لحاظ سے فقروں کو پُر لطف بنانے کے لئے قوانین کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ قوانین اکثر بے ساختہ اور بوجہ ہوتے ہیں، فقروں کی نحوی ساخت ان سے متاثر نہیں ہوتی۔ البتہ جہاں التزاماً قافیے کا استعمال ہوا ہے وہاں فقرے کی ساخت اس تکلف اور اہتمام کو صاف ظاہر کر دیتی ہے۔ ادبی لحاظ سے مٹھی نثر کے بے ساختہ ٹکڑے دلچسپ ہیں۔ لیکن غالب کی اردو نثر کی دلکشی کا انحصار قوانین پر نہیں ہے بلکہ اس مجلسی احساس اور جذبہ رفاقت پر ہے جس کے مطابق وہ مراسلے کو مکالمہ اور تحریر کو تقریر کا رنگ دے رہے تھے۔ انہی جذبات و احساسات کے پُر غوص اظہار نے خطوط غالب کے ادبی حسن کو نمایاں کیا ہے۔

لیکن غالب کے سبھی خطوط اس ادبی فضا کے حامل نہیں ہیں۔ کئی خطوط کا رد و باری مسائل اور دنیوی معاملات کے بارے میں ہیں۔ غالب کی معاملہ شناسی اور حالات و زمانہ کے مطابق کارروائی اور مناسبت کا احساس ان خطوط سے بخوبی واضح ہے۔ ان خطوط میں جذبے اور خیال سے زیادہ حقیقت پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔ بعض خطوط میں علمی بحثیں ہیں۔ وہ خطوط جن میں علمی نکات بیان ہوئے ہیں ان کا انداز بیان بڑا سادہ اور منطقی ہوتا ہے۔ سادگی کے ساتھ وضاحت و صراحت غالب کا شیوہ خاص بن گیا تھا۔ سادہ علمی نثر کا یہ نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

”تذکیر و تالیف کا کوئی قاعدہ مندرجہ نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے۔ جو جس کے کانوں کو گئے جس کو جس کا دل قبول کرے۔ اس طرح کہے۔ ”تھ میرے نزدیک ذکر ہے۔ یعنی ”تھ آج“ لیکن جمع میں کیا کروں گا؟ ناچار سوائٹ بولنا پڑے گا۔ یعنی ”تھیں آج“ خبر سوائٹ ہے باتفاق، مگر کاغذ اخبار داس کو خود کچھ لو کر تھارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ نہیں تو ذکر کہوں گا۔ یعنی اخبار آیا۔ پھر ہوتی یا ہوا؟ یہ منطقی عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ دو شنبہ ہوا، پھر کا دن ہوا، نری پھر ہوتی یا پھر ہوا۔ ہم کیوں پولیس کے؟ ”بلبل“ میرے نزدیک سوائٹ ہے۔ جمع اس کی بلبلیں۔ غلطی بولتا ہے، بلبل بولتی ہے۔

[خطوط غالب، صفحہ ۷۳۷]

غالب کی ادبی نثر کے ساتھ ساتھ علمی نثر کے یہ نمونے اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ اردو نثر کے فروغ و ترقی میں جہاں اس وقت ادبی اظہار کے لئے نئے نئے پیرایوں کی ضرورت تھی، وہاں علمی اظہار کے لئے بھی اسی غوص اور منطقی پیرائے کی ضرورت تھی جس میں کوئی مشو و زوائد نہ ہوں۔ بلکہ علمی معلومات اس سادگی، سلاست اور روانی کے ساتھ طالبان علم تک پہنچا دی جائیں کہ ان کے ذہن پر زبان اور طرز بیان کا کوئی بوجھ بھی نہ پڑے، اور وہ علمی حقائق تک بہ سہولت پہنچ جائیں۔

اظہار مطالب کے لئے اردو زبان ہر دور میں اپنے دامن کو وسیع کرتی رہی ہے۔ غالب کے زمانے میں انگریزی اثر و نفوذ شروع ہو چکا تھا۔ نئی حکومت کے ساتھ نئی تہذیبی، تمدنی اور علمی اصطلاحات اور الفاظ اردو کے دامن میں آ رہے تھے۔ غالب انگریزی نہیں جانتے تھے۔ البتہ انگریزی کے جو الفاظ اس دور میں عام طور پر رائج ہو چکے تھے، ان سے آگاہ تھے۔ چنانچہ ان کے خطوط میں انگریزی کے اکثر الفاظ اٹل جاتے ہیں۔ مثلاً گٹ، پوسٹ پیڈ، جرنل، بکس، پاکٹ (پیکٹ)، پارسل، پمفلٹ، پاکٹ، کونسل، لیکچر (شراب)، سارٹیکلیٹ، کسپ، چیف سیکرٹری، کشنر، ڈپٹی کشنر، رپورٹ، ایگریمنٹ، پالیسی، کل، گورنمنٹ وغیرہ یہ الفاظ کثرت سے اور بہ ساختہ طور پر ان کی تحریروں میں آ جاتے ہیں۔ مثلاً:

”یوں تمام عمر بخوشی گزار جائے لیکن تم کے برس، کے مہینے، کے بچنے کا انگر ہنٹ لکھتے
ہو۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۸۰]

”یقین ہے تم رپورٹ کرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم آ جائے گا۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۱۱۶]

”یقین ہے کہ یہ خطا کل پرسوں اور وہ پاکٹ پانچ دن میں پہنچ جائے۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۱۵۷]

سرمایہ زبان میں اس توسیع کے علاوہ ادبی و علمی اظہارات کے لئے مناسب حیرائے اختیار کرتا،
غالب کا یہ وہ کارنامہ خاص ہے جو اردو زبان و ادب میں قابل قدر ہے۔ غالب کے بعد سرسید کا
زور اردو نثر کے فروغ کے لئے مہم زدگیں کہلاتا ہے، اور غالب نے اردو کو اس مقام تک پہنچانے
میں تاریخی کردار سرانجام دیا ہے جو نا قابل فراموش ہے۔

محاسن خطوطِ غالب

مکتوب نگاری غالب کے مزاج کا جزو لا ینفک معلوم ہوتی ہے جس کی اہمیت کا اظہار ان کے کلام میں بھی جانا ہوا ہے:

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

یہ ”ذوقِ خامہ فرسائی“ خطوطِ غالب کی فنی قدردانیت کا جائزہ لینے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بایں ہمہ غالب نے جب اردو میں خط نگاری کا سلسلہ شروع کیا تو ابتدا میں کسی ادبی تخلیق یا نادر تحریر کا خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ سیدھی سادی اردو نثر کے بارے میں ان کے ذہن میں یہ خیال آ بھی کیسے سکتا تھا۔ انہیں تو ایک عرصے تک اپنے فارسی کلام کے مقابلے میں اردو کلام کی عظمت سے بھی انکار ہی رہا:

فارسی میں تا بہ بنی نقش ہائے رنگ رنگ
مگور از مجموعہٗ اردو کہ ہے رنگِ من است

پھر ایک ایسے زمانے میں جب علماء و فضلا اپنی نثری تحریریں ابھی فارسی ہی میں لکھ رہے تھے، غالب اپنی ”سادہ“ اردو تحریریں کیونکر ادبی دنیا کے سامنے پیش کر سکتے تھے۔^۱ بہر حال

(۱) خطوطِ غالب کی مہارت کا سال سب سے پہلے نومبر ۱۸۵۸ء میں ٹی بی ہرگوپال اور شیونرائن نے ظاہر کیا جس میں صلاحِ منظورہ کر کے اظہار کیا۔ غالب نے اس اعزازِ علمی پر بوجھت دو یہ اختیار کیا اس سے خاکہ بردار بیان کی بہ غرہائی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ان عزیزوں کے خطوط کے جواب میں لکھتے ہیں:

(بقیہ ماثیلہ اگلے صفحے پر)

زمانے کا فیصلہ زیادہ قوی اور اٹل ہوتا ہے۔ غالب کا اردو کلام اور اس سے بھی زیادہ ان کے اردو خطوط اپنے گونا گوں گہری وقتی محاسن کی بدولت ادب میں ایک بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔ غالب کو یہ مقام فطری صلاحیتوں کے علاوہ اپنی ارتقاء کی چند منزلیں طے کر کے حاصل ہوا۔

غالب ایک جذبات پسند فنکار تھے۔ یہ آنا کا شدید احساس اور جدت پسندی کا تقاضا ہی تھا جو انہیں تقلید سے اجتناب کی طرف لے آیا اور پھر وہ مگر و فن کی ان اچھوتی فضاؤں تک پہنچے جہاں عظیم ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ غالب نے شعر و سخن کا آنا مزنا فرشتے فارسی مرزا امجد القادر بیدل مرزا اجال امیر شکست بخاری وغیرہ کی پیروی میں کیا۔ انہوں نے طرز بیدل کی پیروی کا اعتراف ایک مقلعے میں یوں کیا ہے:

طرز بیدل میں رہنمائی کھنکھاتا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

تقلید کی اس راہ پر کچھ عرصہ کام زن رہنے کے بعد وہ اس سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں جس کا اعتراف وہ اپنے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

”پندرہ برس کی عمر سے مجھیں برس کی حرکت مضامین خیالی کھنکھاتا۔ اس برس میں بڑا
دیوان جمع ہو گیا۔ طرح قبیلہ آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اور اوراق یک قلم چاک کیے۔“

”رقعات کے چھاپے جانے میں ادبی غشی نہیں ہے۔ لوگوں کی سی خدمت نہ کرو، بلکہ اگر گھماری غشی اسی میں ہے تو صاحبِ احم سے پوچھو تم کا اختیار ہے۔ یا میر سے خلاف رائے ہے۔“

(خط نام بر کوٹاں، ۲۰ شنبہ، ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ ع)

”اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی ناممکن بات ہے۔ کوئی دقت ایسا ہوگا کہ میں نے نظم سنجال کر بوردل لگا کر کھاروگا، اور نہ صرف تو میر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری غنڈری کے ٹکڑے کے بتاتی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اردو پر ظاہر ہوں۔ غلام یہ کہ ان رقعات کا چھاپا ہانا میر سے خلاف طبع ہے۔“

(خط نام شیونان، ۲۰ شنبہ، ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ ع)

اس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دینے۔

(خط ہمام عبدالرزاق شاکر، خطوط غالب، مرحومہ مولانا مہر علی شاہ، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۵۳)

مشق سخن کی ابتدائی منزلیں بڑی کٹھن اور صبر آزمائیں۔ بعض معاصرین انہیں مہمل کوثر اردو سے رہے تھے، اور وہ بڑی شان استغنا سے اس قسم کے حلوں کو دکر رہے تھے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

مگر نہیں ہیں مرے اشعار میں سخی نہ سخی

لیکن غالب اگر ایک طرف رو بانی مزاج کے حامل تھے تو دوسری طرف ایک حقیقت پسند ذہن بھی رکھتے تھے۔ ان کی معاملہ شناسی اور حالات سے مناسبت و مطابقت پیدا کر کے زندگی کو خوشگوار بنانے کا ثبوت اکثر خطوط سے ملتا ہے۔ اس معاملے میں بھی انہیں اپنی کچھلی روش ترک کر کے عصری فنی تقاضوں کا پاس کرنا پڑا۔ اور پھر معنوی عظمت اور شوکت لفظی کے حسین استخراج سے لے کر سادہ و سہل متفتح انداز تک، انہوں نے فن شعر کا وہ ”تاج محل“ بنا کر پیش کیا کہ جس کی عظمت و رفعت کا اعتراف ہم مصرعوں نے بھی کیا اور آنے والے زمانے کی گرویدگی تو مستمم ہے۔

غالب کو اپنی فارسی دانہ پر اس حد تک فخر تھا کہ وہ اپنے پیش رو پر عظیم کے فارسی دانوں میں اسوۂ میر خسرو اور کسی حد تک فیضی کے کسی کو درخور اتنا خیال نہ کرتے تھے۔ یہی باعث تھا کہ وہ اپنے فارسی کلام کے مقابلے میں اردو کلام کو ”بے رنگ من است“ کہتے رہے۔ لیکن آخر انہیں اپنے اس رویے میں بھی لچک پیدا کرتی پڑی۔ اردو خطوط کے بارے میں کچھ اس سے بھی زیادہ نازک معاملہ پیش آیا۔ پر عظیم میں اسلامی مہد میں علامہ کی زبان فارسی رہی اور غالب کے زمانے تک، اردو کے پھیلاؤ کے باوصف، علامہ اپنی نکارشات کے لیے فارسی ہی کا سہارا لے رہے تھے۔ پھر غالب جیسے ذہن و فکر کا آدمی کیونکر یہ روش خاص چھوڑ کر سیدھی ساری اور عوامی زبان کو منہ لگا سکتا تھا۔ ایک عرصے تک وہ فارسی ہی میں مکتوب نگاری کرتے رہے اور اس زبان میں انشاپردازی کے جوہر دکھاتے رہے۔ پھر قدرتی طور پر ایک وقت آیا آیا جب قوی جواب دینے لگا اور فرصت زندگی کم نظر آنے لگی۔ محنت، مشقت کا وہ بار بار نہ رہا جو فارسی تحریروں و عالمانہ شان سے غائب کر سکے۔ اس لیے ضرورت نے سیدھی ساری روزمرہ اردو اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ غالب نے ایک حقیقت

شناس اور معالجہ فہم انسان کی طرح اس تبدیلی سے بھی سمجھوتہ کر لیا۔ پھر جو روش مجبوری یا معذوری کے تحت اختیار کی گئی تھی، جب اسی میں غالب کی جدت پسند ادبی شخصیت کا بے ساختہ اظہار ہونے لگا اور اس کی من و خوئی آشکار ہوئی تو آخر عمر میں، جب شعری تخلیق کے سوتے خشک ہو چکے تھے، یہی روش ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا سرچشمہ بن گئی۔ اس طرح شاعری کے علاوہ اردو نثر میں بھی غالب کی عظمت فن کا ایک اور روشن مینار تعمیر ہوا۔

غالب کے جو خطوط اس وقت تک سامنے آئے ہیں ان کے مطابق ان کی اردو خطوط نویسی کا آغاز مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ فارسی خطوط نویسی میں کمی اور اردو خطوط میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۱ء میں (خاترج آجنگ کی تحریر سے دو سال قبل) فارسی میں خطوط لکھنے ترک کر دیے گئے۔ بعض لوگ فارسی میں خط لکھنے کا تھاخاک کرتے تھے تو غالب معذرت کے ساتھ اردو میں خطوط نویسی کی وجہ دیتا دیتے تھے۔ مولوی نعمان احمد کے نام ایک خط (محررہ ۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء) میں لکھتے ہیں:

”برسوں سے خطوط فارسی لکھنا چھوڑ دیے۔ اب شہزادہ بشیر الدین میرزا شیخ سلطان منظور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق فن کے حکم کے ہے اور وہ مطاع ہیں اور نہیں مطیع۔“

[خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر صفی، ۶۵]

غالب کی اردو خطوط نویسی کی ابتدا کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ مولانا حالی نے تھوڑے مغلّی کے تعلق (۱۸۵۰ء) اور مسعود قیامت کو بوجہ قرار دیا ہے۔ لیکن ۱۸۴۸ء کے اردو خطوط اس موقف کی تردید کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس امر میں خود غالب کے بیانات زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ ان بیانات سے اردو خطوط نویسی کی ابتدا کے علاوہ فارسی میں اظہار کی دقتوں اور اردو میں اظہار کی سہولتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور پھر جب یہ باتیں غالب جیسا اپنی فارسی پر ناز کرنے والا شخص کہتا ہے تو اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ کتابی زبان بہ ہر حال اکتسابی ہی ہوتی ہے۔ اس میں انسان خواہ کتنی ہی مہارت، ہم پہنچائے، اسے فطری اور بامحکف طریق اظہار کا وسیع مشکل ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ غالب کے وہ خطوط جن میں انہوں نے فارسی خطوط لکھنے کے

بارے میں مفذوری کا اظہار اور پھر اس کی وجوہ بیان کی ہیں، اس مسئلے کو پہ خوبی حل کر دیتے ہیں۔
عمر کی ایک خاص منزل پہنچ کر ضعف و ناتوانی کا احساس اور فارسی میں انشا پر دلائی کا معیار قائم
رکھنے کے لیے یہ تکلف عبارت آرائی اور اس کے لیے محنت چڑھائی و جگر کاوی، یہ وہ بنیادی اسباب
تھے جو غالب کو ساوہ اردو خطوط نویسی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

”انسوس کہ میرا حال اور یہ لیل و نہار، آپ کی نظر میں نہیں، دور نہ آپ جانیں کہ اس بچے
ہوئے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل اور اس سرے ہوئے دل پر کیا کر رہا ہوں۔ خواب
صاحب، اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں زور۔ سخن محسری کا ایک ملک باقی ہے، بے
تامل اور بے لگرجو خیال میں آجائے وہ کلموں، دور نہ لکری مصوہت کا محتمل نہیں ہو سکتا۔“

[خط بنام انور الدولہ شفق، خطوط غالب، ص ۶۳-۶۴]

”بارہ برس کی عمر سے قلم و نثر میں کاغذ یا قند اپنے نامہ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ ہاتھ
برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جاں میں
تاب و توان نہیں۔ نثر فارسی لکھنی ایک قلم موقوف۔ اردو۔ سو اس میں عبارت آرائی
متروک۔ جو زبان پر آوے، وہ قلم سے نکلے۔ پاؤ رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر، کیا
لکھوں اور کیا کہوں؟“

[خط بنام میر غلام حسین قدیر بکراپی، نکات بہت دوسم فروری ۱۸۵۷ء]

”بندہ نواز، فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ چراغ سری و ضعف کے
مصدوموں سے محنت چڑھائی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت فریادی کو زوال
ہے اور یہ حال ہے۔“

منضبط ہو مجھے قوی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب کو، جن سے خط و کتابت رہتی ہے، اردو ہی میں نیاز
نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے نہیں نے فارسی زبان میں
خطوط و مکاتیب لکھے اور کیجئے تھے، ان میں جو صاحب الی الاذن ذی حیات و موجود ہیں،

اُن سے بھی عند الضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔ پاریس کنکریوں، رسالوں، نسخوں اور کتابوں کے مجموع شیرازہ بست، چھاپا ہو کر اطراف واقعاتِ غم میں پھیل گئے۔ حال کی نثر کو کون فراموش کرنے چائے؟ جان کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر و تعلق دوبار سے دست بردار و سبک دوش کر دیا۔ جو نثر میں کہ مجموع و یک جا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آئندہ ہوں، انہیں کو چننا اب احدیثِ جلد منظمہ مقبول قلوب اہلِ سخن و مطبوع طابع اربابِ فن فرمائے اور میں اب انتہا سے عمرنا پائیدار کو پہنچ کر آفتابِ لبِ بام اور جہنمِ امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے زعمہ درگزر ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیے۔ نظم و نثر کے گھرو کا انتظام اپنے دو ناتواں کی حمایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔ پس اُمیدوار ہوں کہ انہیں نذر و محقرہ یعنی تحریرات روزمرہ و اردو سے سادہ و سرسری کو تا امکانِ نفیست جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش و لاریش و فرد و مامدہ کا کشاکشِ معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔ اللہ بس ماسوئی ہوں۔“

[خطِ بنام عبدالرزاق شاہر، خطوطِ غالب، صفحہ ۷۵۳]

غالب نے کار و پاری اور معاطاتی ضرورتوں کے تحت اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے اور سادگی سے مطلب نویسی پر مدد رکھا۔ رفتہ رفتہ ان خطوط میں، جو خاص احباب اور شاگردوں کو لکھے گئے، جذباتی عنصر اظہار و بیان کے حسین نقوش بنانے لگا۔ واقعہً انتخاب (۱۸۵۷ع) سے پہلے غالب کے خطوط میں کار و پاری معاطات کے علاوہ علمی مسائل اور ادبی خیالات کے اظہار نے اسلوب میں گونا گوں کیفیات پیدا کرنی شروع کر دی تھیں۔ لیکن واقعہً انتخاب کے بعد ان کے اردو خطوط میں ادبی لحاظ سے ایک عظیم تغیر پیدا ہوا، جس کے کچھ نفسیاتی محرکات تھے۔

(۱) مثلاً عشقِ ہر گز پالِ نقد کے نام غالب کے مندرجہ ذیل خطوط (حوالہ خطوطِ غالب، از مہر) قابل

ذکر ہیں۔ نشان ۳ (اپریل ۱۸۵۲ع) نشان ۷ (جون ۱۸۵۲ع)، نشان ۸ (دسمبر ۱۸۵۲ع)، نشان ۱۳ (نشان ۱۶،

نشان ۱۸ (۲۱ اگست ۱۸۵۳ع)، نشان ۲۵ (۲ مارچ ۱۸۵۳ع)

واقعہ انقلاب ایک ایسا حادثہ عظیم تھا جس نے ملک کی اجتماعی زندگی کو نئی طرح متاثر کیا۔ انقلاب کے اسباب، واقعات اور اثرات تو تاریخ کا اہم حصہ ہیں لیکن غالب کی ذات پر اس کے جو اثرات پڑے وہ دہلی لحاظ سے بڑے زوردار نتائج کے حامل تھے۔ غالب بقول جلی ایک جوان ظریف تھے۔ اس نوع کا انسان مجلسی زندگی کا دلدادہ ہوتا ہے۔ غالب بھی ایک مجلس پسند انسان تھے۔ وہ کثیر الاحباب تھے۔ واقعہ انقلاب نے اس مجلسی زندگی کو درہم برہم کر دیا۔ اگر یہ وہی نے سقوط دہلی کے بعد مسلمانوں کو خاص طور پر نشانہ انتقام بنایا اور انہیں شہر سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا بلکہ ایک عرصے تک انہیں شہر بدر رکھا گیا۔ غالب اس انقلاب عام سے محفوظ اور

(۱) غالب کے بعض خطوط میں ان واقعات کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔

”۔۔۔ یعنی ایک خط میں نے مثلی بی بھٹی صاحب کو بھیجا، اس کا جواب لکھ کر آیا اور ایک خط تمہارا رقم بھی موسم پٹشی ہر گر پال اور تخلص بدلتا ہوا آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دئی اور اس خطے کا نام ملی بڑوں کا خط ہے، لیکن ایک دوست اس خط کے دوستوں میں سے مجھے پایا جاتا۔ واقعہ وحوش نے کو مسلمان اس شہر میں نہیں دتا۔ کیا امیر، کیا فریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ خود اہل کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔“

[خط نامتقد، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء، خطوط غالب، ص ۱۵۴]

”مسلمان آدمی شہر میں مذکور بن گئے لیکن مسلمانوں کا چارم کو خط نہ پہنچ سکا۔“

[خط نامتقد، ۵ مارچ ۱۸۵۸ء، خطوط غالب، ص ۱۵۴]

”تو بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار گنت چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں آگاہیت چاہے بقدر مقدور فہرہ داندے۔“

[خط نام میر محمدی بکرا، ۲۱ فروری ۱۸۵۹ء، خطوط غالب، ص ۱۵۸]

”اے میری جان! یہ وہی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہی نہیں جس میں تم شعبان یک کی حویلی میں مجھ سے چمٹے آیا کرتے تھے۔ وہی نہیں جس میں اکیلے دن برس سے عظیم ہوں۔ ایک کپ ہے۔ مسلمان۔ اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، ذاتی سرسرا ہوا۔“

[خط نام ملاؤ الدین ملانی، ۲۰ فروری ۱۸۶۳ء]

دہلی میں مقیم رہے۔ لیکن ان کے عزیز احباب ان سے بچھڑ گئے۔ غالب کے لیے یہ ایک طرح کی قید تھی جس کا ان کے قلب و ذہن پر بڑا شدید اثر ہوا، اور وہ اس عالم تنہائی میں بڑی گھٹن اور بے بسی محسوس کرتے تھے۔ تنہائی کے اس تلخ احساس کو دور کرنے کے لیے انہوں نے خطوط کا سہارا لیا۔ ڈاک کا انتظام معقول ہو چکا تھا جس سے ان کے اس روحان کو تقویت ہوئی۔ اس طرح غالب کی اردو خطوط نویسی کو ایک نئی فضائی۔ اگر پہلے یہ خط زیادہ تر کاروبار و دنیاوی اور معاملات ضروری کی خاطر لکھے جاتے تھے، تو اب یہ خط کاروبار شوقی اور جنکین دل کے لیے لکھے جانے لگے، اور خطوط نگاری کے ذریعے اس مجلسی خلا کو پُر کیا جانے لگا جو واقعہً انقلاب سے پیدا ہوا تھا۔ اس لیے اب غالب کے خطوط محض نامہ نگاری کا وسیلہ نہیں رہے تھے بلکہ مجلس آرائی کا ذریعہ بن گئے تھے۔ تنہائی کی خاموش فضا میں احباب سے ملاقاتیں ہونے لگیں^۲۔ یہ ملاقاتیں جسم و روح کی نہ کسی لیکن اس سے کچھ کم بھی نہ تھیں۔ ان ملاقاتوں نے خطوط غالب میں وہ ادبی ماحسن پیدا کیے جن کی بدولت غالب کا ادبی مقام (خطوط کے آئینے میں) نہ صرف اردو ادبیات میں بلکہ عالمی ادبیات میں بہت اونچا نظر آتا ہے۔

(۱) غالب نے نقد کے نام ایک خط میں اس کی تفصیل بتائی ہے۔

”محب پر ہمتو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا ایام رہا ہوا۔ ہیں مگر ٹیکوں کے اور وہ دور کہ جس زمانہ نزدیک بہادری پٹیل کے راجا صاحب نے سامراجان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ وقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہے۔ چنانچہ بعد چھ راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ اور نہ میں کہاں اور یہ شعر کہاں؟“

(۲) ”انسان کرو، کتنا کثیر الامواب دلی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔“

[خطوط غالب مرتبہ میر، صفحہ ۱۵۹]

”وہ ایک دن کے بعد جب جی ہاتھی کرتے کو چاہے گا، تب ان کو دیکھوں گا۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۱۶۰]

[ایضاً، صفحہ ۱۶۱]

”بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کچھ، نہ کالہ ہے۔“

”تم کیسے؟ میں تمہارے، مثلی جی مخلص صاحب اور جناب مرزا عاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمہارا اور ان کا

[ایضاً، صفحہ ۱۶۲]

آنا لکھتا ہوں۔ قریب گویا وہ کالہ ہے جو بایں ہم ہوا کرتا ہے۔“

(قریب عاشیا لکے صفحہ پر)

مجلسی فاضلین بے تکلف احباب کی جو غیر رسمی ملاقاتیں شب و روز ہوتی ہیں، وہ انسانی زندگی کی متاع عزیز ہیں۔ ان ملاقاتوں میں احوال دل سے لے کر کوائف روزگار تک ہر موضوع پر باتیں ہوتی ہیں۔ اپنی کہی جاتی ہے، دوسرے کی سُنی جاتی ہے۔ اس طرح دل کا بوجھ بہت حد تک ہلکا ہو جاتا ہے۔ آرام روزگار کو سہنا سہنا آسان ہو جاتا ہے۔ پھر انسان کی زندگی پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ اپنی معرفت کے بچے ہوئے لگوں پر نظر ڈالتا ہے تو ایک خواب و خیال کی طرح زود بوحیات کی مختلف کڑیاں نظروں کے سامنے آئے لگتی ہیں۔ اُس وقت انسان میں اپنی زندگی کے مشاہدوں اور تجربوں کو دوسروں تک منتقل کرنے کی فطری خواہش پیدا ہوتی ہے۔ آپ جی یا خود نوشت سوانح عمری لکھنے کا رجحان بھی عام طور پر اُس دور میں پیدا ہوتا ہے جب انسان شباب و شبیب کی دادیوں سے گزر کر کھولت کی منزل میں قدم رکھتا ہے۔ آپ جی سنانے کی یہ فطری خواہش مجلسی ماحول ہی میں چری ہو سکتی ہے۔ غالب کی اردو خطوط نویسی کا سلسلہ بھی زندگی کے اسی مرحلے میں شروع ہوا۔ واقعۃً انتساب کے بعد انہوں نے مجلسی ماحول سے محرومی کا دردِ ادا خطوط سے کیا۔ ان محرکات نے اُن کے خطوط میں مراسلہ نگاری اور مکالمہ نگاری کے فاسلوں کو ختم کر دیا۔ وہ اپنے خطوط میں جو فضا قائم کرتے ہیں، اُس میں وہی کیفیات ملتی ہیں جو اس قسم کی شبابِ مفلوں میں عام طور پر ہوتی ہیں۔ خبریں سنانا، خبروں پر تبصرے، باتیں کرنا، مکالمے، شکوے شکایتیں، ماحول کی مرقع کشی، زندگی کی فضا پیدا کرنے کے لیے لپیٹے اور بذلہ نئی، زندگی کی آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار، آرزوؤں کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والے غم سے خود تباہ کرنا اور دوسروں کو بھی حوصلہ دلانا، غالب کے خطوط کی اہم خصوصیات ہیں اور انہی خصوصیات کے فن کارانہ اظہار نے اُن کے خطوط میں ادبی محاسن کو اجاگر کیا ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

”میں اس تمہاری میں صرف خطوں کے محروم سے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا، میں نے ہانکا کہ، جس بھر بھر لایا“

[ایضاً، صفحہ ۷۷۹]

”مرزا صاحب، میں نے دعا دعا کر لی کہ تم میرا لکھا ہے کہ مراسلہ مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار گویں سے بڑا بان لکھا تھا کیا کرنا، ہجر میں وصال کے حیرے لایا کرو۔“

[ایضاً، صفحہ ۷۸۷]

”بھائی! کچھ اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ بہتم اور مرزا وقت میں مراسلہ و مکالمہ ہوگی ہے۔ دروہا میں کرتے ہیں۔“

[ایضاً، صفحہ ۷۸۷]

خطوط غالب کے لٹی و ادبی محاسن کا جائزہ لیجئے ہوئے اس امر کو بھر حال ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ غالب خط کو خط کچھ کر ہی لکھ رہے تھے، اسے داستان، آپ بیتی، انشائیہ، افسانہ یا ڈراما سمجھ کر نہیں لکھ رہے تھے۔ اس لیے ان کے خطوط میں کاروباری اور معاملاتی امور بھی ہوتے ہیں اور علمی مسائل پر بحثیں بھی ملتی ہیں۔ خطوط کے اس حصے کو ادبی محاسن کے اعتبار سے نہیں بلکہ اسلوب نگارش کے اس پہلو سے دیکھا جاسکتا ہے کہ غالب نے ان مسائل و معاملات کے بیان میں سادہ و سلیس نثر کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ قافیوں کا استعمال، جو خطوط غالب کی ایک اہم خصوصیت ہے، اس قسم کے موقعوں پر عموماً نہیں ہوتا۔ اس لیے اس حصے کو ہم علمی نثر کہہ سکتے ہیں۔

دوسری بات جو اس جائزے کے سلسلے میں قابل توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ غالب کے خطوط مختلف اصحاب کے نام لکھے گئے۔ اصولاً خط کی تحریر و ترسیل میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے خط کاتب و لہجہ آغاز سے اختتام تک متعین ہوتا ہے۔ جذباتی عنصر عام طور پر انہی خطوط میں مل سکتا ہے، جو ایسے اشخاص کو لکھے جاتے ہیں جن کے ساتھ انسان بے تکلفی سے دل کی بات کر سکتا ہے۔ ادبی لحاظ سے غالب کے وہ خطوط زیادہ اہم ہیں، جو بے تکلف اصحاب اور عزیز ترین شاگردوں کو لکھے گئے۔

القاب و آداب:

غالب نے خطوط نویسی کے قدیم اعداد کو، جسے وہ ”محمد شاہی روشیں“ کہہ کر پکارتے ہیں، یکسر بدل دیا۔ اس تبدیلی کا احساس خطوط غالب کے آغاز میں القاب و آداب کے استعمال ہی سے ہو جاتا ہے۔ غالب اس بارے میں انور الدین شوق کو لکھتے ہیں:

”یہ دیکھو، یہ خط لکھنا نہیں ہے ہاتھیں کرنی ہیں اور یکجا سبب ہے کہ نہیں القاب و آداب نہیں لکھتا۔“

[خطوط غالب، مرتبہ میر، صفحہ ۳۶۲]

مکتوب نگاری کا جو نیا انداز غالب نے اختیار کیا تھا اس میں رسمی القاب و آداب کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ تاہم غالب نے فرق مراتب کو بھر حال ملحوظ رکھا ہے۔ اس کا انداز مختلف مکتوب الیہوں کے نام خطوط کے مطالعہ سے ہو جاتا ہے۔ القاب میں بے تکلفی اور ندرت وہیں تک ہے جہاں مراسم

کی نوعیت اس کی جائز و ناجائز ہے۔ جہاں ادب و احترام واجب ہوتا ہے، وہاں القاب میں کمالات احترام آجاتے ہیں۔ مثلاً خدیجہ خاتم غوث خاں بے خیر کے نام خطوط میں: میر مرشد، قبلہ، قبلہ جا جات، جناب عالی، حضور، حضرت، میر مرشد، بندہ پرورد وغیرہ، انور الدولہ شفیق کے نام خطوط میں: میر مرشد، قبلہ، کعب، خداوند، وقت، جناب بھائی صاحب، قبلہ، نواب امین الدین احمد خاں کے لیے برادر صاحب، جمیل، المناقب، عجم الاحسان وغیرہ، اور جہاں تعلقات میں زیادہ یکساںت نہیں ہوتی، وہاں القابات میں بھی رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت، مخدوم و کرم، جناب عالی، صاحب وغیرہ۔ اب ذرا بے تکلف احباب اور شاگردوں کے نام خطوط میں القابات کی حدت و عمدت ملاحظہ فرمائیے:

علاؤ الدین احمد خاں علائی:

"میرزا نسیمی کو دعا پہنچے، صاحب، مولانا نسیمی، میری جان، میری جان علائی ہمدان،

جان غالب، علائی مولائی، مرزا علائی، یار بھتیجے کو یا بھائی مولانا علائی اعدا کی دہائی،

میاں، اقبال نشانا، جانا عالی شان، جانا جانا ماہے میری جان، ابھی مولانا علائی وغیرہ۔"

ششی ہرگوپال تفتہ:

مہاراج، بھائی، شفیق، بالتحقیق ششی ہرگوپال تفتہ سلامت رہیں، بندہ پرورد، کاشانہ دل کے

باورد ہفتہ ششی ہرگوپال تفتہ، صاحب، ششی صاحب، جان من و جانان من، میرزا تفتہ، نور

نظر و لخت جگر مرزا تفتہ، بر خودار شفیق میرے کرم فرما میرے امی مرزا تفتہ کیوں

صاحب، دیکھو صاحب، میاں، میری جان، بر خودار مرزا تفتہ، میاں مرزا تفتہ، صاحب

بندہ، حضرت، نور چشم غالب، از خود رفتہ مرزا تفتہ، آؤ مرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ اور

میری حقیقت سنو، میرے میراں، میری جان میرزا تفتہ، علیدان (بیشتر خطوط بغیر القاب

کے شروع ہوتے ہیں)۔

مرزا احاتم علی بیگ مہر:

بندہ پرورد، صاحب میرے، بھائی صاحب، بندہ پرورد، شفیق، بالتحقیق مولانا مہر ذرا بے

مقدار کا سلام قبول کریں مرزا صاحب۔

میر مہدی مجروح:

میاں، صاحب، کیوں یا رکیا کہتے ہو؟ سید صاحب، بھائی، میری جان، میر مہدی،
میاں لڑکے، آبا بابا! میرا بیٹا میر مہدی آیا، جان غالب، لو صاحب، لو میاں سید زادہ
آزادہ دلی کے عاشق و لہو، جو یارے حال دلی و اور سلام لو، نور چشم میر مہدی، آئیے
جناب میر مہدی صاحب دہلوی بہت دنوں میں آئے۔ کہاں تھے؟ بر خوردار کا مگر میر
مہدی۔

باتیں کرنا، مکالمے، خبریں سنانا:

القاب و آداب کی اس بے تکلفی کے ساتھ ہی دوسرا اہم پہلو، جس نے خطوط غالب کو
اولی لحاظ سے مکمل و دلچسپ بنایا ہے، وہ باتیں کرنے کا انداز ہے۔ ہم اس کے نفسیاتی محرکات پر
پہلے گفتگو کر آئے ہیں۔ اولی اسلوب میں باتوں کے انداز میں جو انہایت، یکا گت اور بے تکلفی
ہوتی ہے وہ کسی اور انداز بیان میں نہیں ہوتی۔ میر تقی میر کو بھی اپنے اس انداز خاص کی دلکشی کا پورا
احساس تھا:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ بنے گا

پڑھتے کسی کو سینے کا تو دم تنک سر ڈھنپے گا

غالب خطوط کے ذریعے، جس مجلس ماحول کو پیدا کرنا چاہتے تھے، وہ اسی انداز نگارش
سے ممکن تھا۔ انہوں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مراسلے کو مکالمے کی جو صورت دی اُس میں
مکالمے (Dialogue) بھی ہیں اور بات چیت کی مجلس کیفیت بھی:

”بھائی صاحب کا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور میرے خط کے جواب میں ہے۔ وہ

ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا جب اُن کو خط لکھوں گا۔“

[خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر صفی، ۱۶۰]

”اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھے باتیں کرنے کا حوصلہ

دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔“

[خطوط غالب، مرتبہ مولانا مہر صفی، ۲۸۶]

”اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ خط کو سرنامہ کر کے کہا کہ دیتا ہوں کہ ڈاک میں
دے دوں گے“

[ایضاً۔۔۔ صفحہ ۳۶۱]

”اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا، جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا، یاد دہ کیا لکھوں۔“

[ایضاً۔۔۔ صفحہ ۳۸۱]

باتیں کرنے کے اس انداز سے نثر میں زندگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور جذبہ شنہ و شایہ
محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی جیتے جاگتے ماحول میں بیٹھا ہے جہاں احباب ہا ہمدگر مصروف گفتگو ہیں۔
اس میں حرف و حکایت بھی ہے اور شکوہ و شکایت بھی۔ باتیں کرنے اور شنہ والے کے درمیان اتنا
قرب ہوتا ہے کہ باتوں کے علاوہ ایک دوسرے کے دل کی ہز و تپیں بھی سن سکتے ہیں۔ اسلوب
میں اس انداز سے باہمی اعتماد اور رفاقت کی جو فضا پیدا ہوتی ہے اس میں معمولی سے لے کر غیر
معمولی باتوں تک یکساں توجہ سے سنی جاتی ہیں اور انسان اُن میں لطف لینے لگتا ہے۔ اسلوب کا
یہی انداز ہے جو انشائیہ نگاری (Essay) کے لیے نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اردو میں انشائیہ کی
صنف غالب کے بعد سرسید کے زمانے میں ”تہذیب الاخلاق“ کے اجراء سے ظہور میں آئی۔
لیکن اس صنف ادب کے لیے غالب کے اسلوب گفتگو نے زمین پہلے ہموار کر دی تھی۔

غالب نے اپنے بعض خطوط میں گفتگو کو مزید چاند اور پُر لطف بنانے کے لیے
مکالموں کو بھی جگہ دی ہے۔ غالب کے مکالمے بڑے مختصر اور برجستہ ہوتے ہیں اور جو بات بیان کرنا
وضاحتی انداز میں قرا طویل اور بے کیف ہو سکتی تھی، وہ مکالموں میں بڑی مختصر، چامچ اور دلکش بن
گئی ہے۔ بعض مکالموں نے تو ایسا سماں پیدا کر دیا ہے کہ اُن کی وجہ سے متعلقہ خطوط ادبی لحاظ سے
ضرب المثل بن گئے ہیں۔ مثلاً:

(۱) (غالب): کوئی ہے؟ ذرا ایسے سف مرزا کو بلا لیا

(؟) (لو صاحب، وہ آئے!)

(غالب): میاں! میں نے نکل خط تم کو بھیجا ہے، مگر حصارے ایک سوال کا جواب دہ

گیا ہے، اب سُن لو!

[خط نظام پور سف مرزا، خطوط غالب، صفحہ ۳۰۳]

(۲) (غالب): بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟

(محمد علی): حضرت ما بھی نہیں!

(غالب): کیا آج نہ جائیں گی؟

(محمد علی): آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے!

[خط بنام علاء الدین خان علاقائی، خطوط غالب، صفحہ ۶۹]

(۳) (غالب): تم خوب ہوا

(جیری): کیا کچا!

(غالب): کس کا؟

(جیری): مرزا شمشاد علی بیگ کا!

(غالب): اے! اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو سب علی خاں بیٹھے ہیں، میرا

تنگہ موجود ہے۔

(جیری): واہ صاحب! انہیں کیا خوشامدی ہوں جو منہ دیکھی کہوں؟ میرا شینہ فقط

الغیب ہے۔ غیب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے!

(غالب): ہاں صاحب، آپ ایسے ہی وضع دار ہیں، اس میں کیا عیب ہے!

[خط بنام علاء الدین خان علاقائی، خطوط غالب، صفحہ ۹۱]

اور غالب کا شاہکار مکالمہ تو مندرجہ ذیل ہے جس میں مکتوب الیہ میر مہدی بخروج ہیں

لیکن مکالمہ میرن صاحب سے ہو رہا ہے۔ کتنا برکتہ و لطیف اور دلچسپ اعداد ہے:

(۴) (غالب): اے میرن صاحب، السلام علیکم!

(میرن): حضرت آداب!

(غالب): کیو صاحب، آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟

(میرن): حضور نہیں کیا منع کرتا ہوں؟ انہیں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ تھک رہا ہے

ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے، صرف بخش باقی ہے۔ وہ بھی رفع

ہو جائے گی۔ نہیں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ

دیتا ہوں۔ آپ پھر تکلیف کیوں کریں؟

(غالب): نہیں، میرن صاحب اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دین ہوئے ہیں۔ وہ خطا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔

(میرن): حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خطا کیا ہوں گے۔

(غالب): بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟

(میرن): سبحان اللہ، اے حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

(غالب): اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میری مہدی کو خط لکھوں؟

(میرن): کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور جی اٹھتا۔ اب جو نہیں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط چلائے۔ میں بڑبڑہتا ہوں کہ وہاں نہ ہوں۔ میری دعا لگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھے گا۔

(غالب): میاں، بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لا حول ولا قوۃ۔۔۔

اردو کے افسانوی ادب میں ناول اور ڈرامے کی اصناف بھی غالب کے بعد ظہور میں آئیں۔ لیکن غلطو غالب کے یہ حیران کن بیان ان اصناف ادب کے لیے اظہار و بیان کی راہیں تیار کر گئے۔

مکالموں، ملاو باتوں کے ساتھ ساتھ مجلسی زندگی کا ایک اہم پہلو خبریں سناتے کا ہے۔ خبریں اور خبروں پر تبصرے ایک معاشرتی جبلت ہے جس کی تشکیل احباب کی حیثیت مجلسوں میں ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اس کے ذریعے مجلسی فضا پیدا کر کے اپنی اور احباب کی تسکین دل کا سامان پیدا کیا ہے۔

”آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں، سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں“

[خطوط غالب، صفحہ ۵۷]

”ہم ہمسار سے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ ...“

[ایضاً، صفحہ ۱۸۳]

”سماں لڑ کے! کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ، خبریں سنو!“

[ایضاً، صفحہ ۲۹۵]

خبریں سننے سنانے کی اس معاشرتی حس نے جہاں غالب کے خطوط میں مجلسی رنگ کو اور نمایاں کر دیا ہے، وہاں ان کے خطوط تاریخی لحاظ سے بھی بہت اہم دستاویز بن گئے ہیں۔ غالب نے صحافی تھے نہ مورخ، لیکن وہ احباب کی خاطر وقائع نوٹیں بھی بنے اور صحیفہ نگار بھی، اور اس طرح اپنے خطوط میں عصری تاریخ کا بہت ساقیتی مواد چھوڑ گئے۔ غالب نے ایک نہایت اہم اور ہنگامہ خیز دور میں اپنے احباب کو خطوط لکھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد شہر بدر احباب کے تقاضوں کے تحت انہیں ”سوانح لیل و نہار“ بھی لکھنے پڑے۔ قدرتی طور پر وہ خطوط میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کی بعض ایسی تفصیلات بھی پیش کر جاتے ہیں جو کسی اور ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ وہ واقعات و حالات ہی بیان نہیں کرتے بلکہ رد عمل اور تاثرات بھی قلم بند کر جاتے ہیں۔ اس طرح غالب کے خطوط کا یہ سرمایہ رپورٹاژ کی ذیل میں آ جاتا ہے جسے ادب میں اب ایک الگ صنف کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

خطوط غالب میں بیان کردہ معاصر واقعات و حالات کی تصدیق دوسرے ذرائع سے کر کے ان کی تاریخی حیثیت متعین کی جاسکتی ہے۔ غالب تک اطلاعات یا خبریں مختلف ذرائع سے پہنچتی تھیں۔ وہ ان کا عقلی تجربہ بھی ضرور کرتے ہوں گے۔ خبر اور افواہ میں بفرق ان کے پیش نظر رہتا ہے:

”خلق نے از دوسے قیاس، جیسا کہ دنی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات از ادویہ دو

سارے شہر میں مشہور ہے کہ ...“

[خطوط غالب، صفحہ ۲۸۰]

اس طرح غالب نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کی زندگی کی بہت سی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ جزئیات نگاری کی وجہ سے وہ بعض معمولی معمولی امور کا تذکرہ بھی کر جاتے ہیں۔ یہی معمولی باتیں آج کے محقق کو اس دور کی عمارتی زندگی کے بید گوشوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ دلی کی برہادی اور پھر اس کی چند تہج آبادی کے کوآئف، خاص و عام کی گزراوقات، معاشی حالات، سفر کے ذرائع اور حالات، ڈاک کے انتظامات، موسمی تغیرات وغیرہ ایدہ مختلف امور ہیں جو خطوط کی مجلسی فضا سے ابھر کر اس عہد کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

منظر نگاری اور مرقع کشی:

غالب خط لکھتے وقت نہ صرف اپنے لیے بلکہ مکتوب الیہ کے لیے بھی مجلسی فضا تخلیق کرنے کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ ماحول کا تاثر دینے کے لیے خط کے شروع یا اختتام پر غالب گرد و پیش کے منظر کی ایسی جزئیات پیش کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ اور قاری کی نگاہوں کے سامنے اس فضا کا دکھن مرقع ابھرنے لگتا ہے۔ ادب میں مرقع کشی کے لیے بڑے سلیقے اور نرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حقیقی جزئیات جو کسی موقع کی صورت حال کو اجاگر کر سکیں اور پھر ان جزئیات میں ایسی ترتیب کر کوئی بات نہ اٹھا از ضرورت محسوس نہ ہو، بلکہ ہر معمولی اور غیر معمولی چیز حسن ترتیب سے یکجا ہو کر ایک مجموعی کیفیت پیدا کر دے، ایک ادبی مرقعے کی بنیادی شرائط ہیں۔ مرقع کشی کے لیے محفل سے زیادہ مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرقع وہی کامیاب ہوتا ہے جس میں خارجی ماحول کی خیالی باتیں نہ ہوں بلکہ حقیقی جزئیات ہوں۔ غالب کے خطوط میں منظر کشی اور مرقع نگاری اس لحاظ سے بڑی جامعہ ہے کہ وہ ماحول کی خیالی تصویروں کے بجائے حقیقی

(۱) خواجہ میر محمدی مرحوم کے نام ایک خط میں پتھیرہ حیات کا ذکر فرمائیے۔

"انہیں سب کو سرسبز شہنشاہی ملے گا حکم ہو گیا۔ جو سینے میں سوئی ہو اور رکھاؤ۔ شہنشاہی کڑا بگڑ گیا ہے۔ دے دے اور اٹھنے والے اور اور دے دے بڑی بڑی کھڑیاں دور دورہ نظر آئیں گے کیا ہوں گی۔ اپنی مزک کا آنا اور اس کی رہگزار سال ہونا غور ملتی ہے۔ چاروں نے سے دانا ہوا پلٹی ہے۔ ابر آتے ہیں، مگر صاف بھڑکاؤ ہوتا ہے۔ جیہ نہیں برستا۔ گے ہوں، چنا اجماع میں آنا چاہیے ایک بھاؤ ہیں۔ نویر سارا سے نویر۔"

(صبح چہار شنبہ، جمعہ ۲۹ دسمبر ۱۸۶۱ء، خطوط غالب، صفحہ ۲۹)

تصویریں پیش کرتے ہیں۔ وہ حسن انتخاب اور حسن ترتیب سے اپنے گرد و پیش کی چیزیات سے ایسے مرقعے تیار کرتے ہیں جنہیں چاند کر قادی اس ماحول کا پورا احساس کرنے اور محفوظ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً یہ مناظر اور مواقع دیکھیے !:

(۱) "رات کو خوب چند برسا ہے، صبح کو ختم کیا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ ایرنگ چھا رہا ہے۔ بھینکے کرگھڑی جدہ فاجہ، صبح اپنی بہو اور بچے کے دروازہ کو پارہوں۔ کل آج کی رونا گئی کی بھر چکی۔ یہ لڑکا سعید زلی ہے۔ ایرکامیٹ ہوتا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسائش کے واسطے ہے۔ میرا منظر سرد رہا ہے۔"

[خطوط غالب، حرجہ برصغریٰ، ۶۸-۶۹]

"پانچ ڈکھوانا ہوا۔ دونوں بر خوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے نہیں پانچ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو پیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو پیٹنے ہوئے پایا۔ گھڑی بھران رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھانک بھر تھکی داغ کیا۔ دو شاہی کھاب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی شراب پی، کھاب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھجڑی چکائی۔ طوب تھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھائی۔"

[خطوط غالب، صغریٰ، ۱۱۱]

"میر مہدی صاحب، صبح کا وقت ہے، چاند خوب چڑ رہا ہے۔ آگے شمس سانسے رکھی ہے۔ دھرف لگتا ہوں، ہاتھ چاٹتا ہوں، آگ میں گری کسی بھر جائے وہ آتش سیال کہاں؟"

[خطوط غالب، صغریٰ، ۱۲۰]

"اے میرا میرا میر مہدی آیا۔ آذ بھائی حراج تو اچھا ہے؟ غصہ، یہ دانا پور ہے، دارا سرد ہے۔ جو لطف یہاں ہے، وہ اور کہاں ہے؟ پانی، جہان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوئی اس کا نام ہے۔ یہاں شہر، آپ حیات کی کوئی سوچ اس میں ملی ہے۔"

[خطوط غالب، صغریٰ، ۱۲۵]

"گھڑی میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا بھر دھرا ہے۔ حق پیر ہا ہوں، یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو بھی چاہا، یہ باتیں کر لیں۔"

[خطوط غالب، صغریٰ، ۱۲۹]

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

آپ بیتی:

غالب کے سوانح حیات کے سلسلے میں حالی کی یادگار سے لے کر موجودہ زمانے تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ حیات غالب کے مصداق میں ان کے خطوط کی بڑی اہمیت ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ خطوط میں ان کے بارے میں بہت سی باتیں مل جاتی ہیں، بلکہ اس لیے کہ غالب نے اپنے خطوط میں آپ بیتی کے انداز میں خود اپنی سرگزشت کے بہت سے اوراق پیش کر دیے ہیں۔ آپ بیتی سوانح عمری کی وہ شاخ ہے جس کا موضوع کھینے والے کی اپنی زندگی کے کل دن گزارا ہوتا ہے۔ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ انسانی زندگی میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب انسان کے دل میں فطری طور پر کچھ اپنے بارے میں، گزری ہوئی زندگی کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں، کہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ مہد سے لے کر لہ تک تو سوانح نگاری جا سکتا ہے۔ تاہم آپ بیتی نگار بھی اپنی روزانہ حیات اور فانی وجدانی کیفیات اس وقت تک بیان کر سکتا ہے جب تک دم میں دم ہوتا ہے اور دست و قلم بالکل شل نہیں ہو جاتے:

کھینے رہے جنوں کی نکایات خوں چکان

ہر چہرہ اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غالب باقاعدہ آپ بیتی یا سرگزشت نہیں لکھ رہے تھے، صرف احباب کے نام خط لکھ رہے تھے۔ البتہ یہ خطوط جس مجلس ماحول کی بازیافت کے لیے لکھنے جا رہے تھے اس میں دیگر احوال و کوائف کے علاوہ مجلس زندگی کا یہ دھماکا بھی پیدا ہوا کہ نکتہ نگار اپنے احباب کے سامنے اپنی اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کی جھلک بھی پیش کرے۔ چنانچہ غالب نے مختلف خطوط میں اپنے بارے میں اتنا کچھ لکھ دیا ہے، اور اس انداز سے لکھا ہے کہ اگر اس مواد کو جلیقے سے ترتیب دیا جائے تو اس سے غالب کی ایک آپ بیتی تیار ہو جاتی ہے (جیسا کہ بعض حضرات نے اس سلسلے

”میر ساحت کمال تہ مجھ، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گل سادات خان کی خیر ہے۔ میں جس مکان میں

رہتا ہوں، عالم یک خان کے کڑے کی طرف کا دروازہ کر گیا۔ مسجد کی طرف کے دروازے کو کھاتے ہوئے

جور و زور تھا کر گیا۔ سبز مہیاں گرا پا ہتی ہیں۔ صبح کے چیلنے کا مجھ کو جھک رہا ہے۔ چلتی چلتی ہو گئی ہیں۔

پیدا کفری بھر رہے تو چست گھنڑ بھر رہے۔“

میں کوشش بھی کی ہے۔ اس آپ بیتی میں جیتا جاگتا غالب، اپنے غموں اور خوشیوں، اپنی آرزوؤں اور خواہشوں، اپنی محرومیوں اور شکستوں، اپنی احتیاجوں اور ضرورتوں، اپنی شہنیوں اور بذلہ نجیوں کے ساتھ زندگی سے ہر صورت میں نباہ کرتا ہوا ملے گا:

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

یہ ادراک سرگزشت ایک ایسی شخصیت کے ہیں جو فنا کا شدید احساس رکھنے کے باوجود اپنی احتیاجوں، اپنی کمزوریوں اور اپنی بدحواسیوں کا احساس بھی کر سکتی ہے اور ان کا اظہار بھی ا۔
آپ بیتی کا یہ وہ نازک مقام ہے جو تلواری کی دھماکے سے بھی زیادہ تیز ہوتا ہے۔
غالب اپنے خطوط میں مرتے دم تک اپنی ذہنی کیفیات کے نقشے اور بیتی ہوئی زندگی

(۱) ملا قربان علی جگہ۔ کک کے نام خط میں یہ انداز ملا نظر فرمائیے۔ خود احتیاجی کی اس سے بہتر مثال ادب میں مل مشکل ہے:

”اپنا آپ کا شامی بن گیا ہوں۔ رنج و رات سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا لیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں۔ لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اترا تا تھا کہ نہیں بڑا شاعر اور قاری دان ہوں۔
آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ کچ تو یوں ہے، غالب کیا سرا، بڑا ملحد سرا، بڑا کافر سرا۔ ہم نے از دواہ تعلیم جیہ پادشاہوں کو بعد ان کے ”جنہ آرام گاؤ“ ”عرش نشین“ خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے کو شاہ و ملکہ و ملکہ جانتا تھا، مستر مقرر ”گور“ پلو پلو ایہ“ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ ”آئیے ہم اللہ بھادرا“ ایک قرضدار کا گریبان میں دھجھ، ایک قرضدار بزرگ سے رہا ہے۔ نہیں ان سے بچ چرہ ہوں۔“ ایسی حضرت خواب صاحب انراب صاحب کہیے، دو تھان صاحب! آپ کھوتی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا ہے لڑکھی ہو رہی ہے؟ بکھو آسمو، بکھو لو۔“ لکھنے کیا ہے حیا، یہ حضرت، کونگی سے شراب، لکھو گی سے گلاب، بڑا ز سے کپڑا میوہ فروش سے آم بصراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا، کہاں سے دہلے گا۔“

[خطوط غالب، جلد ۱۹]

کے مرتفع پیش کرتے رہے۔ ان امور نے خطوط کی ادبی روح کو (آپ جی کے نقطہ نظر سے) بڑا دلچسپ اور دلکش بنا دیا ہے۔ اور ہم ان خطوط کے آئینے میں ایک ایسی آفاقی شخصیت کی جھلک دیکھتے ہیں جو زندگی کا ایک خاص سرسبز فلسفہ رکھتے ہوئے زندگی کی محرمیوں اور ناکامیوں سے ہمدرد آ رہا ہے۔ یہ عظیم شخص اپنی ناکامیوں اور محرمیوں پر گہوڑا نہیں بلکہ ان پر استہزا کرتا ہے۔ وہ زندہ دلی اور خوش ہاشی سے جینے کی نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ غم و الم کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھتے ہوئے غم سے نباہ کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ شاعری میں بھی اور خطوط میں بھی۔ شاعری میں اگر وہ ایک منظر بن کر جذبہ غم کا تجزیہ کرتا ہے تو خطوط میں زندہ دلی سے غم کے برداشت کرنے کا عملی ثبوت دیتا ہے، اور اس طرح ایک ایسے حوصلہ مند انسان کا نمونہ پیش کرتا ہے جو آلام روزگار کو نہ صرف اپنے لیے آسان بنا لیتا ہے بلکہ دوسروں میں بھی ضبط و برداشت اور حوصلہ مندی و زندہ دلی کے جذبات ابھارتا ہے۔ جس انسان کا نظریہ حیات یہ ہو:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

جی خوش بھرا ہے راہ کو بوندِ خار دیکھ کر

اس کے ضبط و حوصلے کی انتہا کیا ہو سکتی ہے! خطوط غالب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ضبط و حوصلے کے یہ بندھن جب کبھی ٹوٹنے لگتے ہیں تو وہ نہایت زندہ دلی و خوشی سے پھر ان کو استوار کر کے سیلاب غم کو بے اثر بنا دیتے ہیں۔ خطوط غالب کی یہ مہماتی روح اور حیات بخش عناصر ایسے ہیں جو غالب کی آپ جی کو زندہ و تابندہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور ہم اسے ایک غیر معمولی صلاحیتوں اور عظیم ذہن و فکر کے انسان کی سرگزشت سمجھ کر دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ حقیقت اور رومان کا استخراج کبھی کبھی اس قسم کی کیفیات کا سرچشمہ بن کر سامنے آتا ہے:

میاں تمہارے انتقالات ذہن نے مارا۔ نہیں نے کب کہا تھا کہ تمہارا کلام اچھا نہیں؟

نہیں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی خلیہ نہیں وہ قدر دان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور نہیں مشقِ فہم میں مستغرق ہوں۔ بوطی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو نہ مانج

اور بے فائدہ اور موبہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سے راحت و رکار ہے

اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور سادہ سادگی سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر

کوئی اتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گناہ میں

تو کیا؟ کچھ عہد معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی۔ باقی سب دہم ہے اسے یاد رہا۔ ہر چند وہ بھی دہم ہے۔ مگر نہیں ابھی اس پاپے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور عہد معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالم ہر گز میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو یہاں ہی برسرِ دہا ہوں لیکن سب کو وہم چاہتا ہوں۔ یہ دہا نہیں ہے سراب ہے۔ سستی نہیں چدار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ تا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہیں گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو ہوگا؟“

[مخلوط غالب، صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵]

زندگی کے بارے میں یہ فکر و احساس اگرچہ اس انگیز ہے مگر آفاقی سطح کا حامل ہے!

شوخی و طرافت:

غالب نے آنسوؤں اور قہقروں کے درمیان زندگی اور زندگی کا احساس دلانے کی جوداد معاش کی، اس میں شوخی و طرافت کا عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ سرچشمہ غم سے بھونکنے والی طرافت کوئی معمولی درجے کی طرافت نہیں ہوا کرتی۔ اس میں زندگی کی حقیقتیں اور زندگی کے تضادوں سے پیدا ہونے والی بصیرتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس قسم کی طرافت کی تخلیق کے لیے دل گدافت ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک عظیم ذہن و فکر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب قلب و ذہن کے اعتبار سے اس مقام پر تھے جہاں اس قسم کی اعلیٰ طرافت کے سرچشمے بھونکتے ہیں۔ غالب کا اجتماعی ماحول غم انگیز تھا۔ محفلیں و مہمان ہو گئی تھیں۔ احباب بچھڑ گئے تھے۔ موت کی گرم بازاری نے ہر طرف اندر دہی پکڑ لی اور بے رونقی پھیلا دی تھی۔ اس اندر وہ اور اس انگیز ماحول میں بھی غالب نے خوش طبعی سے زندگی بسر کرنے کا جو ضابطہ حلیات اپنایا، اس کو وہ اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اپنے احباب کو بھی اس میں شریک کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اجڑی محفل کی بے رونقی کا کچھ توداد ادا ہو جائے:

دلی لگی کی آرزو بے غمین رکھی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سود چراغِ محفہ ہے

”دل بھی“ کے اس رجحان نے اُن کے خطوط میں شوقی و طرافت کی ایسی ایسی شگوفہ کاری کی ہے کہ غم کا احساس رکھتے ہوئے بھی انسان مسکرائے کی ہمت پیدا کر لیتا ہے۔ زندہ دلی سے جینے کا یہ قرینہ اُن مواقع پر خاص طور سے کامل وید ہوتا ہے جب غالب اپنے کسی آزدوہ خاطر دوست کو حزن و غم کے موقع پر خط لکھتے ہوئے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں۔ زندگی میں سوت ایک بہت بڑا حادثہ اور قدرتی طور پر غم کا باعث ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ موقع اُن اصحاب کی آزمائش کا ہوتا ہے جو غم کے اس موقع پر تعزیت کا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور سب طرف سے لاچار ہو کر مسمی جملوں اور پیرایوں کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن غالب کی زندہ دلی ایسے مواقع پر بھی جس طرح تعزیت جیسے رقت انگیز موضوع کو طرافت کا عنوان بناتی اور غم زدہ انسان میں صبر و ضبط کا حوصلہ پیدا کرتی ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ تعزیت کے دو مواقع ملاحظہ فرمائیے:

”امراؤ شکمہ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ!“

ایک وہ ہیں کہ دو ہار ان کی بیڑیاں کٹ جائی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو چٹائی کا بھندہ اگلے میں پڑا ہے، نہ پھندا ہی ٹوٹا ہے، نہ دم ہی لگا ہے۔ اُس کو سمجھاؤ کہ شیں حیر سے بچوں کو پال لوں گا، تو کیوں جا میں پھنستا ہے؟“

[خطوط غالب، ص ۸۷]

”مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ جینے کا برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی میری۔ ابتدائے شباب میں یک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو نہ بد و ورع منظور نہیں۔ ہم باغِ فسق و فجور نہیں۔ یہ ”کھاؤ“ ”مڑے“ ”اڑاؤ“ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی کبھی ”بوشہد“ کبھی نہ ہو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ کرے۔“

[خطوط غالب، ص ۸۷]

تعزیت کے علاوہ شکوے اور تنگی کے مواقع پر بھی وہ ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی تلخی محسوس نہیں کرتا، بلکہ محظوظ ہوتا ہے۔ شکوے میں بھی غالب نے اپنی حدت طبع کی بدولت ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے:

”تغیر شکوے سے بُرا نہیں مانتا، مگر شکوہ کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی

خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے حد نہ سوڑے اور معہذِ اوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔“

[خطوطِ غالب، صفحہ ۳۱۹]

”کیوں صاحب، یہ امر ایسا کیا دشوار تھا کہ آپ نے نہ کیا؟ اور اگر دشوار تھا تو اس کی اطلاع دینی کیا دشوار تھی؟ ابھی شکایت نہیں کرتے، پھر چلتا ہوں کہ آیا یہ امور متقصنِ شکایت ہیں یا نہیں؟“

[خطوطِ غالب، صفحہ ۳۲۲]

”بہرِ مشد، بارہ پہنچے تھے، نہیں نکلا اپنے چنگ پر لینا ہوا، حق دلی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ نہیں نے کھولا، پڑھا۔ پھلے کو انگر کھا یا کرتا کھلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو نہیں کہ بیان چھاؤ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؟ نقصان میرا ہوتا۔“

[خطوطِ غالب، صفحہ ۳۶۶]

خطوطِ غالب کے ادبی محاسن کے سلسلے میں اور بھی کئی باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ قدمِ زمانے کی منگی و مسکینِ نثرِ تکلف اور اہتمام کی وجہ سے خاصی بدنام ہو چکی ہے۔ لیکن قافیوں کا التزام اگر بہ تکلف ہونے کی بجائے بے ساختہ ہو تو ادبی نثر میں شعریت کا لطف و کیف پیدا ہو جاتا ہے۔ خطوطِ غالب میں گاہے بگاہے بے - ساختہ قوافی فن کی نثر میں حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ لفظی رعایتوں، صنعتوں، نادر تشبیہوں اور جملوں کے ذریعے بھی وہ اپنی سادہ نثر میں رنگینی پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں، جو مجموعی طور پر خطوط کی دلکشی کا باعث ہیں، محاسنِ خطوطِ غالب کے سلسلے میں اضافی کہی جاسکتی ہیں۔ اصل حسنِ تحریرِ خطوط میں غالب کی ادبی شخصیت کے بے ساختہ اظہار کا ہے، جس کی گونا گوں کیفیات کا مجمل ساتھ کرہ صفات، جمل میں ہوا۔

محاسنِ خطوطِ غالب کو پیش کرنے کے سلسلے میں مغرب کے بعض نامور ادیبوں کی اسی نوع کی نگارشات سے موازنے کی صورت بھی ممکن ہے (جیسا کہ پہلے معمول رہا ہے) لیکن ہم یہ کام مغرب کے نقادوں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے ہاں کے نامور ادیبوں کی نگارشات کا غالب سے موازنہ کر کے ان کی عظمت کا لوہا منوائیں!

غالب کا اجتماعی احساس

بر عظیم پاک و ہند میں مغل سلطنت کے انحطاط کے ساتھ سیاسی کشش کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ غالب کے زمانے تک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ملک کے بیشتر حصوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری قائم ہو گئی تھی۔ مرہٹہ جنگ (۱۸۰۳-۱۸) میں لارڈ کلیک نے ۱۸۰۳ء میں آگرہ سے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کیا۔ مرزا غالب کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ ان فتوحات میں جنرل ایک کے ساتھ تھے۔ فتح دہلی کے بعد کٹ پتلی مغل بادشاہ (شاہ عالم ثانی) جو پہلے مرہٹوں کے زیر اثر تھا، اب کمپنی کے کنٹرول میں آ گیا۔ اس کے بعد بر عظیم میں کوئی ایسی بڑی قوت موجود نہیں تھی جو کمپنی کی پٹھانوں کو روک سکے۔ پنجاب کی سکھ شاہی، کمپنی کے مقبوضات اور افغان سلطنت کے مابین ایک عارضی بفر شیت کا کام دے رہی تھی۔ کمپنی کی ہانک اور ایسی رہا تھیں ”سب سنڈی امیری سسٹم“ اور الحاق کی حکمت عملی کے تحت جان کنی کی حالت میں تھیں۔ اس طرح عملاً سارا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگین آ چکا تھا اور کشت و خون کا وہ بازار قدرے سرد ہو گیا تھا جو اٹھارویں صدی میں مغلوں کے مرکزی نظام حکومت کی کمزوری کی وجہ سے خاصا گرم رہا تھا۔ نظم و نسق کے قیام سے اجتماعی زندگی بظاہر بڑھ سکون ہو گئی تھی۔ کاروبار، برسل و رسائل اور زراعت وغیرہ معمول پر آ گئے تھے۔ آجڑے ہوئے نگر آباد ہونے لگے۔ کمپنی کا مرکز حکومت اگرچہ ٹھکانے تھا لیکن دہلی، انگریزی تسلط کے بعد پھر آباد ہونے اور اپنا سکویا ہوا قدر بحال کرنے لگی۔ لال قلعے کا شاہی اقتدار تو ایک عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا لیکن برائے نام مغل بادشاہ کے نام سے اس کا ایک بھرم سا باقی رہ گیا تھا۔

سیاسی کشش یا جنگ و جدل کا سلسلہ ختم ہو کر ماحول بظاہر بڑھ سکون ہو گیا تھا لیکن اس

کے ساتھ ہی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی جنگ کا ایک دوسرا مرحلہ شروع ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار نے ملک سے بد امنی اور شورش تو ختم کر دی لیکن خود یہ اقتدار جس صورت میں قائم ہوا وہ یہاں کے تاریخی حالات اور تہذیبی روایات کے منافی تھا۔ اگر منسل سلطنت کو ختم کر کے برسرِ اقتدار آنے والی طاقت یہاں کے حالات و روایات کے مطابق ہوتی اور حاکم و محکوم کے درمیان رنگ و نسل اور تہذیب و تمدن کی معاشرت کی ادنیٰ ادنیٰ دیواریں نہ ہوتیں، تو یہ انقلاب حکومت ملک کے لئے بڑا فخر آید ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ نئے فاتحین انجینی تھے اور انجینی بن کر ہی یہاں اپنا راج قائم کرنا اور ملکی دولت اور وسائل کا استحصال کرنا چاہتے تھے۔ سامراج کا یہ دوا انوکھا روپ تھا جس سے برعظیم کے باشندوں کو کبھی ساہتہ نہیں بڑا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر نئے نظام حکومت سے یہاں کے باشندوں کی ذہنی و جذباتی مناسبت ممکن نہیں تھی۔ منسل سلطنت، جیسی بھی تھی، یہاں کے باشندوں کے لئے جلا امتیاز نہ سب و ملت ایک طرح کی قوی حکومت کا دور چرکتی تھی۔ کمپنی کی حکومت نفسیاتی طور پر اس کی جگہ پر نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے کمپنی کی عملداری قائم ہو جانے کے باوجود ملک کے جمہور ذہنی طور پر برائے نام منسل بادشاہ سے عقیدت رکھتے تھے۔

کمپنی کی حکومت کے قیام کے ساتھ جو معاشی، تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی تبدیلیاں ظہور میں آ رہی تھیں، ان کو جمہور بجا طور پر شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن مصلحتاً ایسے ہو چکے تھے، اس لئے بے چینی اور اضطراب کی ایک داخلی لہر تھی جو قلب و ذہن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ذہنی و جذباتی کشمکش کا یہ سلسلہ شروع ہوا۔ کمپنی کے مقبوضات میں توسیع کے ساتھ ساتھ یہ اندرونی اضطراب بھی بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں یہ آتش فشاں لاوا انتہائی پہنچ کر بھٹ پڑا۔ لاکھوں انسانوں کی قربانی لے کر یہ آگ فرو ہوئی اور برعظیم پر انجینی سامراج کا سلسلہ ایک تاریخی حقیقت بنا گیا۔

غالب کی ذہنی نشو و نما اس بڑے اضطراب اجتماعی ماحول میں ہوئی۔ والد اور چچا کی وفات کے بعد بچپن ہی سے انھیں سنگین حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ والد اور آرزوؤں اور خواہشوں کی انتہائی فضا اس میں رہے ہوئے زندگی کے تلخ حقائق سے خبردار کرنا ہو کر اپنا راستہ بنانا پڑا۔ غالب ایک رومانی ادیب و شاعر تھے لیکن عملی زندگی میں ہم انھیں ایک حقیقت پسند اور معاملہ فہم انسان کی طرح اپنے نجی مسائل و معاملات سلجھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اپنی چٹن کے جھڑے کے سلسلے میں لکھتے

تک کا سفر سرکار انگریزی میں اپنے موروثی تعلقات کی بنا پر حصول عزت و جاہ کی کوشش، بلکہ مصلیٰ کے دھینے اور مصاحبت شاہ کے علی المرتضیٰ کو کہیں پوینٹ "بٹنے کے لئے تنگ و دو، یہ وہ مراحل تھے جن سے وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے گزرے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں کہنہ کی حکومت کی ذوق خیر خواہی کی اور نہ ہی اس سے کوئی بد وفائی کی۔ اور انقلاب کے بعد جب کئی باشندے جرم و سزا کے شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آتے تھے، غالب کا اپنی پیشین کی بھالی کے لئے کوشش کرنا اور حکام سے رابطہ قائم کر کے اپنے بارے میں شکوک و شبہات کو رفع کرنا، یہ سب باتیں عموماً زندگی میں ذاتی سطح پر بڑی حقیقت پسندانہ نظر آتی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کا ردہ پار زندگی میں اپنے ماحول سے مناسبت کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور جیسا موقع ہوتا تھا اس کے مطابق کارروائی عمل میں لاتے تھے:

"چپکے ہو اور ہواؤں مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطرب نگاہ نہ کرے۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے، ویسا عمل میں آتا ہے۔"

[خط بنام میر مہدی بخروج، خطوط غالب، مرتبہ مہر میں ۲۹۳]

عملی زندگی کا یہ وہ میدان تھا جس میں ایک عام دنیا دار فرد کی حیثیت سے غالب کو حالات سے مناسبت کر کے ذہنیت کو اپنے اور اپنے لواحقین کے لئے خوشگوار بنانا پڑا تھا۔ بعض اوقات اپنی مطلب براری کے لئے غالب خود داری کے معروف مفہوم سے بھی گزر کر حالات سے سمجھوتہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بات اُن کی شاعرانہ آواز کے برعکس معلوم ہوتی ہے، لیکن امر واقعہ کا کیا کیجئے۔ جو لوگ غالب کو ایک قوی بیرونی حیثیت سے دیکھتے اور انہیں بشری کمزوریوں سے بہرا سمجھتے ہیں، اُن کے لئے شاید یہ باتیں ناقابل قبول ہوں۔ لیکن حقیقت موجود ہوتی اس سے گریز اچھا نہیں ہوتا۔ غالب کو ایک عام فرد کی طرح زندگی میں اگر اس طرح کے سمجھوتے کرنے پڑے تو اس میں ان کی بشری کمزوریاں اور حالات کی مجبوریوں بھی قابل لحاظ ہیں۔ لیکن جہاں تک

(۱) بحوالہ مکتوب غالب، چتر گپ، جلد ۱، ۱۳۶ء صفحہ ۱۶

(۲) نثری میں تو غالب کی خود شناسی کا یہ عالم ہے کہ

ہندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں کہ ہم
اُسے ہم آئے وہ کہہ اگر دانتہ ہوا

ان کے ذہنی عمل اور شاعرانہ فکر و احساس کا تعلق ہے، ضروری نہیں کہ عملی زندگی کی یہ مفاہیتیں اس کے راستے میں بھی حائل ہوئی ہوں۔ شاعر کا جسم اگر حالات کا پابند ہوتا ہے تو یہ لازمی امر نہیں کہ اس کی روح بھی حالات میں جکڑی ہوئی ہو۔ ایک انسان کی زندگی کو یوں دو خانوں میں تقسیم کرنا طبعی لحاظ سے شاید ممکن نہ ہو، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ شاعر اور فن کار اس معاملے میں بالعموم دو دنیاؤں میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ ایک دنیا ہم آپ اور شاعر سب کی ہے اور دوسری آرزو کی وہ دنیا جہاں شاعر کا فکر و احساس مادی آلاتوں سے قدرے بلند ہو کر تخیل کے وسیع سرفرزروں کی نگہداشت کرتا ہے۔ تخیل اور حقیقت کی یہ کشمکش زندگی میں لازمی ہے۔ انسان جتنا زیادہ حساس ہوگا، اتنی ہی زیادہ یہ کشمکش شدید ہوگی۔ غالب کا اجتماعی احساس اس لحاظ سے غالب کے اس طرز عمل سے، جو عام کار و بار ریست میں حالات سے مفاہیت کے اصول پہنچی ہے، خاصا الگ معلوم ہوگا۔ اس کا اظہار ان کی شاعری میں بھی ہوا ہے اور خطوط میں بھی۔ چونکہ شاعری میں (خصوصاً غزل میں) صراحت کم اور خارجی ماحول کے بارے میں رمز و کنائے کا انداز زیادہ ہوتا ہے، اس لئے یہاں فکر و احساس کی صحیح جہت کا اندازہ لگانا قدرے دشوار ہے۔ خطوط میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہاں ہم شاعری کی بحث کو الگ رکھتے ہوئے خطوط کے آئینے میں غالب کے اجتماعی احساس کا مطالعہ کرتے ہیں، تاکہ ذہنی کشمکش کے اس دور میں غالب کی سوچ کا یہ رخ واضح ہو جائے۔ پھر اس کے حوالے سے ان کی شاعری کا تجزیہ بھی آسانی سے ہو سکتا ہے۔

خطوط غالب میں ایک رویہ تو حالات سے مفاہیت اور موقع کے مطابق کارروائی کرنے کا ملتا ہے جو غالب کی معاملہ فہمی اور روزمرہ اندیشی کو ظاہر کرتا ہے۔ معاملے کے اس پہلو کے علاوہ خطوط غالب میں حالات و واقعات کے بارے میں وہ ذہنی رد عمل بھی ملتا ہے جس کا تعلق محض غالب کی ذات سے نہیں بلکہ ان کے اجتماعی ماحول سے تھا۔ اس ذہنی رد عمل سے ہم غالب کے اجتماعی احساس کا اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے قلب و ذہن میں اس انقلاب زمانہ پر کیا محسوس کر رہے تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل سکھوں کے چٹن خوار اور رشتہ کے دلیفہ خوار کی حیثیت سے غالب کی روزی کا سامان بنا ہوا تھا۔ سکھوں کی حکومت میں مغل بادشاہت کی آخری نشانی کا وجود

نفسیاتی طور پر منکشف کا ایک اہم منظر تھا۔ اگرچہ یہ منکشف ایک نقطہ ارتقا کی طرف بڑھ رہی تھی اور سوچنے والے لوگوں کے ذہن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں نوا کا رخ دیکھ رہے تھے۔ خصوصاً الحاق کی پالیسی کے مطابق جس طرح دیسی ریاستیں اور سرورڈی امارتیں ختم کی جا رہی تھیں، اس سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آگئی تھی کہ مغل بادشاہت کی آخری نشانی اب قلعہ معلیٰ میں آخری دسویں ہے۔ ۱۸۵۶ء میں استراغ سلطنت اودھ کا ایک بڑے حادثے کی طرح ظہور میں آیا۔ یہ حادثہ بھی آئندہ حادثات کا جانشین بن گیا تھا۔ غالب نے اس موقع پر جو کچھ محسوس کیا، اس کا اظہار ایک دوست کے نام خط میں اس طرح کیا:

”۔۔۔ آپ ملاحظہ فرمائیں ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے؟ اور کی فیض رسانی اور قدردانی کو کیا رہ گئی، اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں۔ جہاں ہی ریاست اودھ نے ہاتھ بکاتے محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت نا انصافی ہوں گے وہ اہل ہند، جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے، اللہ ہی اللہ ہے!“

[خط نام میر تقی میر، حسین قند بکر لکھنؤ، لکھا شدہ بہت دسویں فروری ۱۸۵۷ء]

انقلاب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اٹھنی کو برپا ہوا۔ یہ خط ۲۳ فروری کو یعنی اس واقعہ سے تقریباً آدھائی ماہ پیشتر لکھا گیا۔ اس میں جس واقعہ (استراغ سلطنت اودھ) پر افسردہ دلی کا اظہار کیا گیا ہے، وہ ان بے شمار واقعات میں سے ایک تھا جو بتدریج منکشف کو تیز تر اور انقلاب کے ہنگامے کو قریب تر لگا رہے تھے۔ خود دلی کی ”بزم آفر“ میں خصوصاً اس کی نشاندہی ہوئی آخری طبع ”قلعہ معلیٰ“ میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ سب غالب کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت جس تدریج کے ساتھ اس طبع کو نگاہ کرنے کے لئے اقدامات کر رہی تھی اور لال قلعے کے بے دست و پا تاجدار اور اس کے وابستگان وامن دولت جس بے بسی سے ان حالات کے بہاؤ میں بہہ رہے تھے، اس کا اندازہ اس خط سے لگا سنے جو واقعہ انقلاب سے تین برس پیشتر لکھا گیا:

”مشاہدہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگان جیور یہ جمع ہو کر غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعہ طبعی کو کیا کہیں گے گا، اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھنے کا چاہئیں کبھی اس مسئلہ میں جانتا ہوں اور کبھی نہیں جانتا، اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے، اس کو وہاں

کہاں؟ کیا معلوم ہے اب ہی نہ وہ اب کے ہو تو آئندہ نہ ہوا۔“

[خام تاحی عبدالجلیل جنوں ۱۸۵۳ء، ضابطہ غالب، ص ۵۳۰]

آخر وہ حادثہ پیش آ کر رہا جس کا ایک مدت سے انتظار تھا۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو انقلاب کا آغاز ہوا اور کبھی کی باقی سپاہ نے اگلے روز (۱۱ مئی) دہلی پہنچ کر مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کے نام پر یہاں کا قلم و نسق سنبھالا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء کے تیسرے ہفتے میں انگریزی سپاہ، سکھ لشکر کی معیت میں دوبارہ دہلی پر قابض ہوئی اور ”کالوں“ کے ہنگامے کے بعد ”گوروں“ کی انتقامی کارروائی اور قتل و غارت گری شروع ہوئی۔ اس طرح برعظیم کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ دہلی میں مظاہرہ بادشاہت کی آخری شمع بجھ گئی، اس کے ساتھ کبھی کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے زیر سایہ آ گیا۔

یہ انقلاب عظیم غالب کی نگاہوں کے سامنے برپا ہوا۔ وہ اس خونیں ہنگامے کے بھٹی شاید، بلکہ اس قلم و خون کے شکار تھے۔ ہر چند کہ ہنگامے، انقلاب کے فرد ہو جانے کے بعد روزی کی مشکلات اور پیش کی بازیافت کے لئے غالب کو وہ سب کچھ کاٹنا پڑا جو ایک عام دنیا دار انسان ایسے حالات میں کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کا اجتماعی احساس اس تہذیبی آئینے پر خون کے آنسو بہائے بغیر بھی درہم سا۔ خون پکڑ کے ان قطروں کی تھوڑی سی جھلک تو اس قلمی میں ملتی ہے جو غالب نے علامہ الدین خاں کے نام ایک خط (نمبر ۱۸۵۸ء) میں لکھا ہے:

بکہ فعال ما میری ہے آج	ہر سلطوور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے	زہر ہوتا ہے آب اناس کا
چوک جس کو کہیں وہ قتل ہے	گھر بنا ہے صودہ زعماء کا
شہر دہلی کا ڈتہ ڈتہ خاک	جھٹے خوں ہے ہر مسلمان کا
کوئی داں سے نہ آ سکے یاں تک	آدھی داں نہ چا سکے یاں کا
نہیں نے مانا کر مل گئے پھر کیا	وہی رونا تن و دل و جاں کا

(۱) ”میں سچ زین و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلم و خون کا شکار ہا ہوں۔“

گاہ جل کر کیا مجھے شکوہ سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیسے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اسی طرح کے وصال سے یا رب کیا نئے دل سے داغ بھراں کا

اس کے علاوہ خطوط میں بھی غالب نے اپنے تعلق جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں اظہار وہ بر ملا نہیں کر سکتے تھے۔ انگریزی وارو گیر میں صاف صاف لکھتا اور اسے ڈاک کے سپرد کرنا ممکن نہیں تھا۔ (۱) پھر بھی غالب نے واقعات انقلاب کے سلسلے میں حالات و کوائف بیان کرتے ہوئے وہ بے الفاظ میں اپنے تاثرات و احساسات بھی پیش کر دیے ہیں۔ انقلاب کے بارے میں مذکورہ بالا قسط کے علاوہ مثنوی ہر گوپال تخت کے نام ایک خط میں اس سانچے عظیم کو وہ جس خیال انگیز حیرانے میں بیان کرتے ہیں، اس سے ان کے دل کی کیفیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

(۱) اس مثنوی مثنوی کا اظہار غالب کے بعض خطوں میں ہوا ہے۔ مثلاً

”آری تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو۔ اگر چیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا ہائے گا۔ درنہ قصہ غصہ قصہ تمام ہوا۔ کیسے ہوئے اڑتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے ہو گھسوں؟“ [خط نظام مرزا اشباب الدین احمد خاں ناقد، ۲۷ مئی ۱۸۵۸ ع]
”منفصل حالات کیسے ہوئے اڑتا ہوں۔ ملازمان تھکے پر شدت ہے۔ ہاڑ پرک اور وارو گیر میں جھکا جیسا“
”انصاف کرو بھسوں تو کیا بھسوں؟“ ”یو لکھ سکتا ہوں؟“ ”یو قائل کیسے کے ہے؟“ ”تم نے مجھ کو کھسا تو کیا کھسا؟ اور اب جو میں کھتا ہوں تو کیا کھتا ہوں؟“ ”بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے تم کھسو گے میں بھسوں گا۔“

[خط نظام حکیم نظام نجف خاں، ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ ع]

”تکلم بات میں لے لے رہی بہت کہہ لکھنے کو چاہتا ہے مگر کہہ نہیں لکھ سکتا۔ کرل ڈھنسا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے۔

[ایضاً، ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ ع]

ورنہ اللہ والی راہوں میں۔“

”صاحب اتم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقعہ ہوا؟ وہ ایک جہنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات سر و بہت در پیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے ہمارے دوست ولی تھے اور غشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تھیں تھا۔ ناگوار نہ وہ فرمانبردار، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ اغساب، بعد چند مدت کے پھر دوسرا جہنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جہنم کی حیثیت مثل پہلے جہنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے غشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھے آ یا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم پہ غشی ہر کو پال اور متخلص پہفت ہو، آج آ یا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دئی اور اس محلے کا نام ملی یادوں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جہنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ دعوہ سے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو ہاجر کے ہیں۔ خود البتہ کچھ کچھ آ باد ہو گئے ہیں۔“

[شعبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء، غلطوط غالب، صفحہ ۱۵۲]

اس انقلاب عظیم کو دو جنموں کی قیادت سے بہتر انداز میں پیش کرنا غیر ممکن ہے! دلی اور لکھنؤ کے قتلیم تہذیبی گہواروں کا فنا کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ غالب نے اس پر کوئی باقاعدہ مرثیہ تو نہیں لکھا لیکن وہ اس تہذیبی الجھے کو محسوس کئے اور مضطرب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس احساس و اضطراب کا اظہار غلطوط میں چاہتا ہوا ہے:

”خداوند نفرت“ کیا تم دلی کو آ باد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور رکھے ہوئے ہو، جو حضرت شیخ اکا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کا حال پوچھتے ہو؟ ابن دفتر را گاؤ خورد، گاؤ را قصاب بدو قصاب در دامن و۔“

[غلطوط غالب، مرثیہ نمبر ۳۳۰، صفحہ ۳۳۰]

”لکھنؤ کا کیا کہنا، وہ ہندوستان کا بغداد تھا، اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گرجھی۔ جو ہے سر و پا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصل خزاں!“

[غلطوط غالب، صفحہ ۳۳۰]

(۱) شیخ کلیم اللہ جہان آبادی (نحوالہ غلطوط غالب، مرثیہ نمبر)

”بھائی، کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ ولی کی ہستی منحصر کنی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چونک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جتنا کے ٹیل کی، ہر سال میلہ پنچول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو ولی کہاں؟ ہاں کوئی شہر کلہرو ہند میں اس نام کا تھا!“

[خطوط غالب، صفحہ ۲۹۳]

”بھائی، ہندوستان کا کلہرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں سر مجھے۔ جو زندہ ہیں، ان میں سینکڑوں گرفتار بند بٹا ہیں۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۲۵۶]

”پانچ لکھ کا حملہ ہے ور پے اس شہر پر ہوا؛ پہلا پانچویں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اقبال تھا۔ دوسرا لشکر خانیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و زمین و آسمان و زمین و آوارہ ہستی سراسر آفت گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی جو کے مرے۔ چوتھا لشکر بیٹے کا، اس میں بہت سے بیٹے بھرے مرے، پانچواں لشکر پ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً آت گئی۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۳۶۷]

”۷ نومبر ۱۳ بمبائی الاول سال حال (۱۲۷۹ھ ۱۸۶۳ء) جمعہ کے دن ابو الفخر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون“

[خطوط غالب، صفحہ ۳۶۳]

واقعہ انقلاب کے نتیجے میں مجلسی زندگی میں جو غلابیڈا ہوا اسے تو غالب نے بہت ہی شدت سے محسوس کیا۔ بلکہ غالب کی اردو خطوط نویسی اسی مجلسی خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش تھی جس کے لئے انہوں نے مراٹھے کو مکالمے کی صورت دی ہے۔ صاحب عزت لوگوں کا دار و گیر کا شکر ہونا اور احباب کا شہر بدر ہو کر پھمڑ جانا، ایک ایسا اجتماعی حادثہ تھا۔ جسے غالب نے فنی طور پر بھی محسوس کیا اور اجتماعی طور پر بھی وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔

”نکھر دیکھا جا چھ، درخت جگہ سے اکھڑ کر بدشاری بنتا ہے۔ غلام میری لنگر کا یہ ہے کہ
اب چھڑے ہوئے پار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں۔“

[خط نام میر مہدی محمود، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ ع]

غالب نے اپنے احباب کے نام کئی خطوں میں دہلی کی بربادی اور پھر اس کی بتدریج
آبادی کے سلسلے میں متعدد واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ بیانات اس دور کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ
کرنے اور جائزہ لینے کے سلسلے میں بہت اہم ہیں۔ واقعات کے بیان کے ضمن میں بعض جگہ وہ
اہم سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں اپنے تاثرات بھی پیش کر جاتے ہیں۔ ان تاثرات
کی روشنی میں ہم اس نازک دور کی واقعی کیفیات کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً انقلاب
۱۸۵۷ ع کے بعد جو اہم سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، ان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ اور بر
عظیم کا براہ راست تاج برطانیہ کے زیر سایہ آنا تھا۔ غالب اس تبدیلی پر اطمینان کا اظہار کرتے
ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”حضرت یہاں دو چیزیں مشہور ہیں، ان کے باب میں آپ سے تعذرتی چاہتا ہوں:
ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ آگرہ میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور دھند و راہٹ گیا ہے کہ
کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی محل ہندوستان میں ہو گیا۔ دوسری خبر یہ کہ جناب
ایڈمنسٹرن صاحب بہادر گورنمنٹ نکلنے کے چیف سکریٹری آف اڈ کے لٹیفٹ گورنر ہو گئے۔
خبریں دونوں اچھی ہیں، خدا کرے سچ ہوں۔“

[خط نام مرزا حاتم علی بیگ، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ ع]

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ ع میں برعظیم کے سب باشندے جا
اتما زائد ہندو ملت شریک تھے۔ لیکن آتش انقلاب کے فروغ ہونے کے بعد برطانوی حکومت نے
سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپا اور ”مُتھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کی حکمت پر عمل کرتے ہوئے
ہندوؤں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کی بیخ کنی کا سلسلہ شروع کیا۔ دہلی میں مسلمانوں کو شہر بدر
کرنے اور مسلمان شرفاء کے دار و گھر کا شکار ہونے کے اکثر واقعات خطوط غالب میں بیان ہوئے
ہیں جن سے ہندو مسلم کی اس نفی سمرانی تفریق کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض جگہ معاملہ اس سے مختلف

بھی تھا۔ مثلاً لکھنؤ کے بارے میں غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

”بیانی بکھتر میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی حملہ داری میں ایسا امن و امان ہوگا نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی حملہ داری میں یہ یقین ہوگا۔ اور ایک نقل سنو وہاں کے صاحب کشف بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ محلے میں ہندو بھرے ہوئے ہیں، اہل اسلام نہیں، ہندو کو لوہے کے تلواریں پہنچ دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ آفت تو دنی پر نوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں حملہ داری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں نکٹ چھاپے گئے ہیں۔ نہیں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے: ”نکٹ آبادی درون شہر دلی بشرط او خال جرمانہ۔“ مقدمہ روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار نکٹ چھپ چکا ہے۔“

[خط بنام میر مہدی بخرواح فروری ۱۸۵۹ء]

میر مہدی بخرواح نے غالب کے بارے میں بھی غالب نے اپنے بعض خطوط میں اظہار خیال کیا ہے۔ بنگلہ انقلاب کے بعد غالب نے اپنی فاشن کی بازیافت کے لئے جو کوششیں کیں اور اس سلسلے میں انہیں جن مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اظہار بھی خطوط میں خاصا تفصیل سے ہوا ہے۔ انگریز حکام سے ملاقاتوں میں بعض اوقات عزت نفس کو نہیں لگتی تو وہ صبر کا دامن پکڑتے اور جب کبھی بارہابی کے موقع پر حسن سلوک کا اظہار ہوتا تو حکام کی تعریف و توصیف کے پل بانہ مٹتے۔ اس طرح غالب کو دہتری نظام کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ بعض موقعوں پر انہوں نے دہتری نظام پر تنقید بھی کی ہے۔ خصوصاً انقلاب کے بعد ہنگامی حالات میں ”سکھا شاہی“ کی طرح ”گورا شاہی“ کا جو سلسلہ دلازدہا، غالب نے اس کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار جا بجا کیا ہے:

”نقل حکم لینی اور پھر مرا فائدہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقال لینی، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہو جائیں۔ حکام بے پرواہی و عدم الفرصت نہیں پا سکتے۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۳۰۰]

”تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ کیا نودہ رائے، کیسی

نقل حکم، کیسا مبالغہ۔ جو احکام کدئی میں صادر ہوئے ہیں، وہ احکام تضاد قدر ہیں۔ ان کا مبالغہ کہیں نہیں۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۳۰۳]

”ایک لطیفہ پرسوں کا سٹو۔ حافظ منو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے، جمل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا: حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ نہیں۔ پھر پوچھا حافظ کو کون؟ عرض کیا کہ نہیں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے، معمولی مشہور ہوں۔ فرمایا، یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ منو بھی تم، جو دنیا میں ہے، وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ جمل داخل دفتر ہوئی، میاں موصی نے مگر چلے آئے۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۳۰۵]

”اے لو، مکی دن ہوئے حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں جڑیاں، ہاتھوں میں جھنڈیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھئے حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نو درائے کی تیار کادی پر قامت کی گئی۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا ہر شخص کی سر و شست کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے، نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۳۰۶]

”زہرا دیکھی یہ گمان نہ کیجئے گا کدئی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلا دشر کی جمل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آئے وہ وہی اپنی کرے۔“

[خطوط غالب، صفحہ ۳۰۷]

غالب کے اشک غم کی جھلک یوں تو طغائی، تختہ دار، مجروح کے نام خطوط میں جا بجا ملتی ہے لیکن یوسف مرزا کے نام مندرجہ ذیل خط میں انھوں نے جس طرح اپنے ذاتی اور اجتماعی غم کی روداد بیان کی ہے، اس سے ان کے داخلی جذبات و احساسات پوری طرح متعکس ہیں۔ ہر حالت

میں خوش رہنے اور زندہ رہی کا احساس دلانے والا غالب جہوم غم کے سامنے سہرا اٹھانے کو نہیں ہوتا، لیکن شدت کرب سے تپ ضرور اٹھتا ہے:

کیوں گردِ غم سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، بیلا د ساغر نہیں ہوں نہیں

”یوسف مرزا میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سوئی ہو جاتے ہیں، مثل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس جہوم غم میں میری قوت متکبرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا حجب ہے، بلکہ اس کا بار نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ غم مرگ میں قلعہ مبارک اسے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گھٹا ہوں: مظفر الدولہ، میرزا ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ، میرزا بہانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خان امین اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا نہیں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا۔ حکیم مرضی الدین احمد خان، میرزا احمد حسین میکیش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاک؟ غم فراق حسین میرزا، میر مہدی، میر مرزا حسین، میرن صاحب، خدا ان کو بیٹا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں ٹوٹتے ہوئے! گھرانے کے بے چراغ، وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، بکیر بکیرے بکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر نہیں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اسوات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم بھری نظر میں تیرا ہوتا ہے۔“

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی بھری بھانج، سبے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں پہنچا۔ بچہ کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی بچہ ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کی ازواج اور اولاد بیک بیک مانتے پھر رہی ہیں اور نہیں دیکھوں اس مصیبت کی تاب لانے کو بیکر چاہیے۔

(۱) اہل قلعہ کو مبارک کہتے تھے۔ اس کے حوادث کی وجہ سے غالب کو پھر پھر نئی پینچو شدت غم میں اسے ”نامبارک“ کہنا پڑا۔
(بھولا ظہور غالب مرزا میر مرزا ص ۴۱)

اب خاص اپنا دکھ دیتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیمان، الاز، یہ پاپر داری کی جو روٹے بچے بدستور، گویا داری موجود ہے۔ میاں گھسن گئے گئے مہینہ بھر سے آگے کہ بھوکا مرنے لگا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، میں آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم اسے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ ہتھکڑی سے رستہ ہے۔ جنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک گھر پر ابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، وہ نہیں، بھوت نہیں، ان رنجوں کا قتل کیوں کر کروں؟“

[۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء/ ۲۲ جمادی الاول ۱۲۷۶ھ]

ذاتی اور اجتماعی ماحول کے اس دکھ ساگر میں سانس لیتے ہوئے بھی غالب نے اگر خوش طبعی کے دیپ جلانے تو یہ بڑے حوصلے کی بات ہے۔

هذه يوم

انتخاب خطوط غالب

نواب امین الدین احمد خان (۱)

بھائی صاحب!

ساتھ برس سے ہمارے تمہارے بزرگوں میں قرائتیں ہمیں پہنچیں۔ بچ کا میرا تمہارا معاملہ یہ کہ پچاس برس سے تم کو چاہتا ہوں، بے اس کے کہ چاہت تمہاری طرف سے بھی ہو۔ چالیس برس سے محبت کا غلو و طرفین سے ہوا۔ نہیں تمہیں چاہتا رہا، تم مجھے چاہتے رہے۔ وہ امر عام اور یہ امر خاص، کیا شخص اس کا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اختلاف پیدا ہو جائے؟ وہ قربت اور یہ مودت کیا بیخود محوئے سے کم ہے۔ تمہارا یہ حال سنوں اور بے تاب نہ ہو جاؤں اور وہاں نہ آؤں؟ مگر کیا کروں، مہالہ نہ سمجھو، نہیں ایک قالب بے روح ہوں:

بچے مردہ قصص ہمدردی رواں

اضطلال روح کا روز افزوں ہے۔ صبح کو تیرید قریب دوپہر کے روٹی، شام کو شراب۔ اگر اس میں سے جس دن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملے، نہیں مر گیا۔ واللہ نہیں آ سکتا، باللہ نہیں آ سکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں ہجر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سکی، دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سکی عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یدو لم یدو ہوں۔

میری زہود ۳ تمہاری بہن، میرے بچے ۴ تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے، اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ۵ ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بے کسوں کے واسطے تمہارا دعا گو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے ہمارا انشا، اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہو گا، کہ تم جیتے رہو

اور تم دونوں کے سامنے نہیں مڑ جاؤں، تاکہ اس کا غلہ کو اگر روٹی نہ دو گے، پتے تو دو گے اور اگر پتے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے۔ نہیں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان ظلم دونوں کے غم میں نہ اٹھوں گا۔

جناب والدہ ماجدہ تمھاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیاء الدین احمد خاں اسی واسطے وہاں پہنچتے ہیں۔ سنو، بعد تھیلے آپ وہاں دو فاکہے اور بھی بہت بڑے ہیں۔ کثرت اطباء، صحبت احباء و بھائی سے نہ طول رہو گے، حرف و حکایت میں مشغول رہو گے۔ آؤ آؤ و شتاب آؤ بھائی۔

میرزا ضیاء الدین خاں ۱۶ تم کو کیا نکھوں؟ جو وہاں تمھارے دل پر گزرتی ہو گی یہاں میری نظر میں ہے۔ خبر دے جائے عزیز عرو دولت۔

نہات کا طالب، غالب

(۲)

ارغ فکرم کے خدام کرام کی خدمت میں بعد ابداء سلام مسنون، بقیہ ہوں، تمھارا شہر میں رہنا سو جب تعزیت دل تھا۔ گوند ملتے تھے، وہ ایک شہر میں تو رہتے تھے۔ بھائی، ایک سیرہ کچھ رہا ہوں۔ کئی آدمی طیور آشیاں کم کردہ کی طرح ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آ جاتے ہیں۔ لو صاحب، اب وعدہ کب وفا کرو گے؟ عطا کی کوکب بھیجیو گے؟ ابھی تو شب کے چلنے اور دن کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ بارش شروع ہو جائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی۔ چلنے والا کہے گا: میں رہو چالاک ہوں، حیراک نہیں۔ لو ہمارے وہلی تک کشتی بغیر کیوں کر جاؤں؟ وہ خانی جہاز کہاں سے لاؤں؟

اے زفرست بے خبر وہ ہر چہ ہاشی زد و ہاش

استاد میر جان صاحب کو سلام۔

عطا کی کے دیوار کا طالب

غالب

یوم النیس ۱۷ محرم ۱۲۸۱ھ

(۲۲ - جون ۱۸۶۴ء)

(۳)

ہمارے صاحب جمیل المناقب عظیم الملاحان، سلامت!۔
 حصار کی تفریح طبع کے واسطے ایک غزل بنی تھو کر بھیجی ہے، خدا کرے پسند آئے اور
 مطرب کو سکھائی جائے۔

آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں۔ سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں۔ کل پنج شنبہ ۲۵ مئی کو اول روز
 بڑے زور کی آغوشی آئی۔ پھر خوب چند برسا۔ وہ جاڑا چڑا کہ شہر کو زکمر پر ہو گیا۔ بڑے درجہ کا
 درد اذہ و حایا گیا۔ قابل عطار کے کوپے کا بقیہ مٹا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا بیج نہ ہو گئی۔
 سڑک کی وسعت دو چند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھانے جاتے ہیں اور ہندو کی دیوڑھوں
 کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور بلی تن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا
 ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خان گلش کی حویلی پر جو گنبد تھے ہیں جن کو عوام گمراہ کہتے ہیں انہیں ہلا
 ہلا کر ایک ایک کی بنیاد و حادثی، اینٹ سے اینٹ بھاری۔ وہاں سے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے
 اکھڑا ریکستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیال مسیر المال عربی، فارسی، انگریزی تین
 زبانوں کا عالم دینی میں وارد ہوا۔ بلی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے
 مل لیتا ہے، باقی گھر کا درد اذہ بند کئے بیٹھا ہوتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام دوپچا، غالب علی شاہ درویش
 کے محلے پر آ جاتا ہے۔ اہل شہر حیران ہیں کہ کھانا کہاں سے ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ باپ سے بھر گیا
 ہے نہیں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی نظر سے گر گیا ہے۔ دیکھئے انجام کار کیا ہو۔ غالب علی شاہ کا
 قول یہ ہے کہ کُٹل کا بھلا ہو۔
 جمعہ ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء

علاؤ الدین احمد خاں علانی

(۴)

صاحب! میری داستان سنئے۔ غصن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زربختہ سر سالہ
 یکبشت مل گیا۔ بعد ازانے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیا رو آنے مجھے
 بچے۔ مئی کا مہینہ بدستور ملا، آخر جن میں حکم ہو گیا کہ غصن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ ماہ

بہا و حسن تقسیم نہ ہوا کرے۔

نہیں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خان کی حویلی میں رہتا ہوں۔ اب وہ حویلی غلام اللہ خان نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب جھڑ گراہی ملیں کہ ایک مجلس اور ایک دیوان خانہ ہو۔ نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ کئی باروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں۔ نہ ملا۔ تمھاری چھوٹی پھوٹی نے بے کس نوازی کی، بکڑوڑ ادالی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ہر چند وہ رعایت مرہی نہ رہی کہ محل سر اسے قریب ہو۔ مگر خیر، بہت دور بھی نہیں۔ کل یا ہر سوں وہاں جا رہوں گا۔ ایک پانو زمین پر ہے، ایک پانو رکاب میں۔ تو شے کا وہ حال، گوشے کی یہ صورت۔

کل شنبہ ۱۔ ذی الحجہ کی اور بے جولا کی کی، پہر دن چڑھے تمھارا خط پہنچا۔ دو گھنٹی بعد سنا گیا کہ امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوشی میں نزول اجلال کیا۔ پہر دن رہے بازار، مہربانی ناگاہ میرے پاس تشریف لائے۔ نہیں نے ان کو ڈبلا اور اندر وہ پایا۔ دل کھوٹا۔ علی حسین خاں بھی آیا، اس سے بھی ملا۔ نہیں نے حسین پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ بھائی صاحب مہربانے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ نہیں نے کہا اکتاہی بتاؤ تم اس کو چاہتے تھے؟ ہنسنے لگے۔ غرض کہ نہیں نے جلاہران کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔

نکاشتہ درواں داشتہ یک شنبہ بین الصغیر والصبر

۱۸۔ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ (۸۔ جولائی ۱۸۶۰ ع) راقم، غالب

(۵)

مولانا نسیمی!

کیوں فنا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف، اہلکاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر خیر! خلیفہ اول ہے (تو) تم خلیفہ ثانی ہو۔ اس کو عمر میں تم پر مقدم رہنی ہے۔ جانشین دونوں، مگر ایک نازل اور ایک ثانی ہے۔

شیر اپنے بچوں کو کھار کا گوشت کھاتا ہے۔ طریق صید اٹھتی سکھاتا ہے۔ جب وہ جون

ہو جاتے ہیں۔ آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سفور ہو گئے۔ حسن طبع خداوار کھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ محمد بن قاسم زرد وول کو تکلیف دو؟ علاؤ الدین خاں، حمیری جان کی قسم، نہیں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی قاسم کر دیا تھا اور دہلا کا نہ جیا۔ مجھ کو اس دہم نے گھرا ہے کہ میری خواست طالع کی تاخیر تھی۔ میرا مصراع بیتا نہیں۔ قصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دئے۔ راجہ علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے۔ پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ دھم سے بھی پرے چلایا۔ نہ صاحب وہابی خدا کی، نہیں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی وضو دوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب، حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے، وہ امر و کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شری کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری، جمہور کے نزدیک ثابت اور حقیقی ہے اور صاحب، تم بھی جانتے ہو، مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو کہ نام و ذلیل نہ سمجھو، تم کو نہیں نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزار باطل اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط قاری و لکھ کر دیتی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، ہر طرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مرا تب تم جانتے ہو ان خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتاؤ۔ اگر میں تمہارے نزدیک میر نہیں، نہ سبکی، باطل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور قہانہ نہ لکھا جائے ہر کارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے غلط سمجھنے کا نہیں سامن۔

غالب

شعبہ ۳ ماہ پر مل ۱۸۶۸ ع

(۶)

جان غالب!

یاد آتا ہے کہ تمہارے ہم نامدار اسے سنا تھا کہ لغات ”وسا حیر“ کی فرہنگ وہاں ہے۔ اگر ہوتی تو کیوں نہ بھیج دیتے۔ خیر:

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

تم شرفورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشوونما پائی ہے اور نہیں ہوا خواہ وہ سائیں نہیں اس نہال کا رہا ہوں۔ کیونکہ تم مجھ کو غریب نہ ہو گئے؟ رہی دید وادب اس کی دودھور تھیں ہیں۔ تم دلی میں آؤ یا نہیں لوہار آؤں۔ تم مجبور نہیں مظلوم۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر ذہنا رسوخ نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ نہیں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو، عالم دو ہیں: ایک عالم اوداع اور ایک عالم آب دگل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو ٹوٹتا رہتا ہے: لمن الملک الیوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: اللہ الواحد القہار۔ ہر چند کہ عہد عام یہ ہے کہ عالم آب دگل کے مجرم عالم اوداع میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم اوداع کے عہدہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آخر میں رجب ۱۲۱۲ھ میں رد بکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا^۲۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام جس^۳ صادر ہوا۔ ایک چیز میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندہ مقرر کیا اور مجھے اس زندہ میں ڈال دیا۔ مگر قلم و نیز کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں ٹیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ پھر تاراپ۔ پایان کار مجھے نکلتے سے پکڑا لائے۔ پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے وہ دھتکڑیاں اور بڑھادیں۔ پانوں چیزیں سے ڈکار، ہاتھ جھکن یوں سے زخم دار۔ مشقت مقرر کی اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گزشتہ چیز کو زانوئے زندہ میں چھوڑ دیا دونوں جھکن یوں^۴ کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے^۵ کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس بار ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آ دی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ نہیں بھی بعد نجات سیدھا عالم اوداع کو چلا جاؤں گا:

فرخ آں روز کہ از خانہ زندہاں بدم

سوے شہر خود ازیں دادنی دیراں بدم

(عالم)

ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ (جون ۱۸۶۱ء)

(۷)

علاقائی مواصلاتی ۱

اس وقت تمہارا خط پہنچا۔ اُدھر چن حادہر جناب لکھا۔ وہ کیا کہتا ہے؟ رام پور کے علاقے کو گاؤں شہک اور مجھ کو نکل یا اس بیوند کے طعنے کو تازیانہ اور مجھ کو گھوڑا بنالیا۔ وہ علاقہ اور وہ بیوند لوہارو کے سفر کا مانع و مزاحم کیوں ہو؟ رئیس کی طرف سے بطریق وکیل محکمہ کسٹمری میں مضمین نہیں ہوں۔ جس طرح اسرا واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح اس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دینی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں۔ کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں۔ آٹھ کبار تھیکے کے لوں۔ چار آدھی دیکھتا ہوں۔ دو یہاں چھوڑ دوں، دو ساتھ لوں، چل دوں۔ رام پور سے جو لفافہ آیا کرے گا لڑکوں کا حافظہ لوہارو بھگوا یا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے۔ شراب مل سکتی ہے۔ کبار ہم پہنچ سکتے ہیں۔ طاقت کہاں سے لاؤں؟ روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے ٹھکرا لیں کہ وہ بہت قریب ہے، جب جاتا ہوں تو ہندوستانی کھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آ کر ہوتا ہے۔ والی رام پور نے بھی تو سرشد زادہ کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ نہیں اب معدوم محض ہوں۔ تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔

بھائی کے اور تمہارے دیکھنے کو کئی بہت چاہتا ہے۔ پر کیا کروں؟ معرب و قوس کے آفتاب یعنی نومبر دسمبر میں قصد تو کروں گا۔ کاش لوہارو کی جگہ گوزگانوہ ہوتا یا بادشاہ پور ہوتا۔ کہو گے کہ رام پور کیا نزدیک ہے؟ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ یہاں انخطاط و انضامال روز افزوں۔ ختم یہاں آ سکتے ہو۔ نہ مجھ میں وہاں آنے کا دم۔ بس اگر نومبر دسمبر میں میرا اخیر صلہ چل گیا بہتر۔

درستہ

اے وائے ز محرومی دیدار و دگر بیچ

غالب

چہار شعبہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ء۔ ہجرام نمبر ۲

(۸)

میری جان اکیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈی ہو گئی۔ پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ فصل اچھی ہو گئی۔ اناج بہت پیدا ہو گیا۔ قریح جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا۔ غرق ہلا۔ سجدہ سجادہ کا یہاں پتہ نہیں، ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی۔ استاد میر جان پہنچ گئے۔ آخر اکتوبر میں یا آغاز نومبر میں خیر رشتاں کو بھی دیں لو۔ پھر عرق دقوس کے آفتاب کا کیا ذکر؟ آبان ماہ آؤ زماہ سے کیا غرض؟

بے تیر دے ماہ و ارادی بہشت بر آید کہ ما خاک ہاشم و خشت استاد میر جان کو ماں راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، دعا، اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام، اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی، اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں، درد اور موافق مضمون اس مصرع کے:

سوئے اللہ واللہ ما فی الوجود

تھوڑا

حضرت وہ "شرف نامہ" نہیں ہے، کسی اصق نے شرف نامہ میں سے کچھ لغات، اکثر لفظ، کتر صحیح، چن کر جمع کئے ہیں۔ نہ دیکھا ہے کہ اس سے جامع کا حال معلوم ہو، نہ خاتمہ ہے کہ عہد و عصر کا حال کھلے۔ ہاں ہم مایاں خیاہ الدین کے پاس ہے۔ اگر وہ آجائیں گے تو ان سے کہہ دوں گا۔ اگر وہ انہیں گے تو ان کو قیمت دے کر ملائی مولائی کو بھیج دوں گا۔

ٹھنی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کہاب جو کچھ تم کھا رہے ہو، مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہو۔ خدا کرے، بیگانہ کی مصری کا ککڑا تم کو میسر نہ آتا ہو۔ کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے گلے سے چبا رہے ہوں گے تو یہاں نہیں رہ سکے۔ سنا چکا ہے چبانے لگتا ہوں۔

نجات کا طالب، غالب

سہ شنبہ ۱۱ اکتوبر ۱۸۶۱ ع

(۹)

صاحب

کل تھمارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچ چکا ہوگا۔ آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور بھائی شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے۔ مولوی صدر الدین میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے۔ یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ سو اس کے موافق صوبہ بن گئی ہیں۔ فتوح کی دوائیں آج آ کر بھیجیں گی۔ کل صوبہ کے لوگ وہ فتوح پیا جائے، مگر اندازہ ادا سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مرہٹوں کی اور ان کے ہوا خواہوں کی رائے میں قصد اس استطاعت کا مذہب ہے۔ نسخے کی حقیقت کو میزان نظر میں تول رہے ہیں۔ استاد میر جان بھی تھے۔ نیم نامہ مقتول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔ سب طرح خیریت ہے۔

کل تھمارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دلی نہیں جس میں تم شہباز بیگ کی حویلی میں مجھ سے چہ بچنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلی نہیں جس میں اکبریاں برس سے مقیم ہوں۔ ایک کسپ ہے۔ مسلمان، اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر خنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاسے ہیں۔ اثاثہ میں سے جو چیزیں ہیں کتنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو جس علی خاں! بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا تنہا دار، سو روپے مہینہ کا روزیدہ خوار بن کر نامراد نہ مر گیا۔ میر نصیر الدین باپ کی طرف سے بھڑا زادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بکشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے تیار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا، اہتمام کار مر گیا۔ تھمارے بچا کی سرکار سے تجویز و تھمن ہوئی۔ بہا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ نکلے کی آمد نہیں۔ مکان اگر چہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھئے کہ تھمارے باضابطہ ہو جائے۔ بڑے صاحب ۳ ساری الماک بیچ کر خوش جان کر کے، ایک بچی دو دو گز بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی

پانسورہ پے کرائے کی اٹلاک داگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تہا وہ خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلندر مجبور اور بہادر گزرا اور باب گنڈہا در فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی روپائیں مٹ گئیں۔ خطر مہد آ دی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو تھکاہ کا حال لکھا ہے۔ وہ بیان واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو بھی کچ جاتو۔ اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر آ سب کا گمان ہرگز نہ کرو۔ خدا چاہے تو استعمال لایا جات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔

یک شنبہ، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ ع عاقبت کا طالب، غالب

(۱۰)

یار بھتیجے، گویا بھائی، بھولانا ملانی! خدا کی دہائی منہ میں دیا ہوں گا جیسا پھر سمجھا اور تم مجھ کو کلمہ بچے ہو یعنی خفائی اور خیال تراش، نہ دیا ہوں گا جیسا مرزا علی حسین خاں بہادر کہے ہوں گے:

اے کاش کسے ہر آنچہ مستم . دائم

دو چاند میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھیں غنوں کا جن سے تمہارے بچا کو گمان ہے مجھ پر جنوں کا۔ جاگیر دار میں نہ تھا کہ ایک جاگیر دار مجھ کو بلاتا۔ گویا نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دو چاند جا کر شاگردی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کڑوا نار ہو، لوہو بہائی کے دیکھئے کونہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جازے کی مری ہا زار ہو؟

کل استاد میر جان صاحب نے تمہارا خط مجھ کو دکھایا ہے۔ میں نے ان کو جانے نہ جانے میں متردد پایا ہے۔ جائیں نہ جائیں، نہیں اپنی طرف سے ترغیب کرتا رہتا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ غلام حسن خاں اگر کسی وقت آ جائیں گے تو ان کو تمہاری تحریر کا خلاصہ خاطر نشان کر دوں گا۔ حق سبحانہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو ان میں سے تو فیقی دے یا مجھ کو طاقت دائم کو انصاف کہ میرے آنے کو دئی کی دل بھگی پر محمول نہ کرو۔ مجھ کو رشک ہے جزیرہ فشیوں کے حال پر اور کچھ فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ اہا ہا ہا:

پڑے مگر پیار تو کوئی نہ ہو چار وار
اور اگر مر جائیے تو لوحِ خواں کوئی نہ ہو

کلیات ۳ کے طبابع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔ قاطع برہان کا چھاپا تمام ہو گیا۔ حق القہف کی ایک جلد میرے پاس آگئی۔ وہ تمھارے ہم نامہ دار کی نذر ہوئی۔ باقی جلدیں، جن کا نہیں طریقہ ارہوا ہوں اور درخواست میری مطبع میں داخل ہے، جب تک قیمت نہ بھیج دوں، کیوں کر آئیں؟ روپے کی تدبیر میں ہوں۔ اگر بچہ بچے جانے تو بھیج دوں۔ تمھارے پاس جو ”قاطع برہان“ پہنچی ہے، اگر چھاپے کی ہے تو بھیج ہے۔ جہاں تر دو ہو غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجہ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو، بلکہ مجھ کو سول لے لو اور اس کو چھاؤ ڈالو۔ آج یومِ انیس ۱۹۔ جون المبارک بارہ پر تین بچے تمھارا خط آیا۔ اوسر پڑھا اور جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین مسعودی ۵ آئے تمھارا خط ان کو دیا وہ پڑھ رہے ہیں، ہم لکھ رہے ہیں، ہوا سر و جل رہی ہے۔

۱۹ جون ۱۸۶۲ ع (غالب)

(۱۱)

میری جان!

سن، پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفت دس، اتوار گیارہ، ایک مڑا ہر مزدان میں نہیں تھا۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ آٹھ شخص میں کوئے دھکا کر پاس رکھ لئے ہیں۔ دوسطرس لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سیک لیا۔ کیا کروں؟ تمھارے خط کا جواب ضرور۔ لو سنتے جاؤ: مرزا شمس الدین بیگ کو تمھارا خط پڑھا دیا۔ انھوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی سمیت پر کیا متوف ہے، مجھے آج سواری مل جائے، کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹوکا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے۔ بس۔

پچاس برس کی بات ہے کہ الھی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین بنی نکالی۔ میں نے حسبِ الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلا دے لوگ سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
بیالہ مگر نہیں دیتا ، نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پانو مٹول مجھے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پانو داپ تو دے

اب نہیں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو
شامل اُن اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ بگاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا
اور پانچ شعر کسی آقو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے، شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا
بعد ہے کہ شاعر حوتی کے کلام میں مطربوں نے غلط کر دیا ہو۔ مقطع بے شک مولانا مغلانی کا ہے اور
وہ شعر جو نہیں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں:

دامان گمہ تنگ و گل حسن تو بہار
گلچن بہار تو ز دامان گلہ داد

یہ دونوں شعر قدسی کے ہیں۔ مطربی تدمائیں اور عرفا میں ہے جیسا عراقی۔ ان کا کلام
دقائق و حقائق تصوف سے لبریز۔ قدسی شاہجہانی شعرائں صاحبِ حکیم کا ہم عصر اور ہم چشم۔ ان کا
کلام شور انگیز۔ ان بزرگوں کی روش میں زمین و آسمان کا فرق۔

بہائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ادھر مقرر اس سے قرض لیا
ادھر درباری مل کو مارا، ادھر خوب چند جین سکھ کی گٹھی جالوئی۔ ہر ایک کے پاس حسک نمبری
موجود، شہد لگاؤ، چائو، نہ مول، نہ خود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پوہیگی کے
سر۔ ہاں ہمہ کبھی خاں نے کچھ دے دیا، کبھی اللہ سے کچھ لوا دیا، کبھی ماں نے آگرے سے بیج
دیا۔ اب نہیں اور ہاں سحر دے آٹھ آٹھ آٹھ لکھری کے، سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک
میر اختیار کار، وہ سو ماہ بامہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ آٹھ لکھیں جدا، چوکیدار جدا،
سو جدا مول جدا، بی بی جدا، بچہ جدا، شاگرد پیر جدا، آدھ ہی ایک سو ساٹھ۔ تنگ آ گیا۔ گزارہ

مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے چھپائش نکالوں؟ قہر درد، لیش، بھان، درد، لیش صبح کو تھریہ متروک، چاشت کا گوشت آدھا رات کو شراب و گلاب موقوف۔ نہیں بائیں روپے مہینہ بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا: تھریہ و شراب کب تک نہ بیچ گئے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ چائیں گے۔ پوچھا: نہ بیچ گئے تو کس طرح بیچ گئے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ چائیں گے۔ بارے میں خاپو رائٹیں گزرا تھا کہ ام پر سے علاوہ بیچ مقرر رہی اور روپیہ آگیا۔ قرض مطلق ادا ہو گیا۔ مقرر رہا۔ خیر رہو۔ صبح کی تھریہ رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔

چنگہ بھائی صاحب نے وہ موقوفی اور بھائی کی پوچھی تھی۔ اُن کو یہ عبارت پڑھا دیا اور حزرہ خان کو بعد سلام کہہ کر

اے بے خبر تو لغت شرب دوام

دیکھا؟ ہم کو یوں پاتے ہیں۔ درجہ کے بیچ اور لوٹروں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل جنس و نفاس میں غلط مارنا اور بے لاد عرفا کے کلام سے حقیقت جذب وحدت و جود کو اپنے دل نشین کرنا اور بے۔ مشرک وہ ہیں جود جود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسئلہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو لائخہ کا مسرمانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ نہیں موجد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجد الا اللہ، لا موجد الا اللہ جیسے کہے ہوا ہوں۔ انبیاء، سب واجب التحظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت فتم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمت للعالمین ہیں۔ متعلق نبوت کا مطلق امامت اور امامت شاہجہانی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علیہ السلام ہے، ہم حسن، ہم حسین، اسی طرح تادمہدیٰ موجود علیہ السلام:

ہمیں زیرِ قسم ہمیں ہمیں

ہاں اتنی بات اور ہے کہ بااحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو حاسی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلا تا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا بعد من ہوں گا

اور روزِ مخ کی آنچ کو تیز کروں گا تا کہ شرکین و منکرین نبوت مصطفیٰ و امامت مرتضوی اس میں
 بلیں۔ سنو مولوی صاحب! اگر بہت دھرمی نہ کرو گے اور کھانا جن کو گناہ جانو گے تو ابستہ تم کو یاد ہو
 گا اور کہو گے کہ ہاں یاد ہے، جن روزوں میں تم علاؤ الدین کو "گلستان" اور "بوستان" پڑھاتے
 ہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپا پچے مارے ہیں۔ خواب امین الدین خاں ان دنوں میں
 لوہارہ ہیں۔ علاؤ الدین خاں کی والدہ نے تم کو یونہی پر سے اٹھا دیا۔ تم پانچم ہرے آب میرے
 پاس آئے۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو اور سردار زادوں کو چشم نہائی سے پڑھاتے
 ہیں مارے نہیں۔ تم نے بے جا کیا۔ آئندہ یہ حرکت نہ کرنا۔ تم تادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نہیں غفل
 ۲ سے گزر کر پچھتاد سالہ ۳ کے واقعہ بنے۔ تم نے کئی قاتلوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے:
 چوں چرخِ شادی حافظ الخ ۴ اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے
 دو چند سرچند ہے۔ مجموعہ نثر جدا گانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر
 اس کے مخالف ہیں:

صوفی بیا کہ آئندہ صاف است جام را
 تا بگری صفائے منے فعل قام را
 شراب ناب خود د روئے نہ جوتناں میں
 خلاف مذہب آناں جمال ایناں میں
 رسم کہ صرفہ شہرہ روز باز خواست
 نان حلال بیخ ز آب حرام ما

ساتی مگر وظیفہ حافظ ز بادہ داد کا شفتہ گشت طرہ دستار مولوی
 میاں نہیں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈسے گیا
 ہے۔ جھتیں لپک رہی ہیں۔ تھماری پھوپھی کہتی ہیں: ہائے دہلی ہائے سری۔ دیوان خانہ کا حال کل
 سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدان راحت سے گھبراتا ہوں۔ جہت چھلنی ہے۔ اور
 وہ گھٹنے پر سے تو جہت چار گھٹنے پرستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیسے ٹکر کرے؟ مینہ

کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اٹھائے مرمت میں نہیں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی چھوٹی کے رہنے کو اور کونسی میں سے وہ بالا خانہ صبح دھلان زیریں جوانی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو وادو۔ برسات گزر جائے گی مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور ہم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مروت کا احسان میرے پاپان عمر میں اور بھی سکے۔

غالب

صبح یک شنبہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ ع

(۱۲)

مولانا غلامی!

میرا دل خوف مرگ نہ دھوائے میر ہے۔ میرا مذہب مختلف عقیدہ و قدر یہ بھر ہے تم نے میرا جی گری کی بھائی نے برادر پروردی کی۔ تم چیتے رہو۔ وہ سلامت رہیں۔ ہم اسی حویلی میں جا قیامت رہیں۔

اس ابہام کی توضیح اور اس کی اجمالی تفصیل یہ ہے کہ چند شدت سے برسا۔ جھون لڑکا ڈرنے لگا۔ اس کی دادی بھی گھبرائی۔ مجھ کو غلطو خانے کا دروازہ غریب روپے اس کے آگے ایک جھونٹا ساسدہ دیا تھا۔ جب تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو نہیں اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ مجھ کو غلطو خانے کو گل سرا بھایا چاہتا تھا کہ گاڑی ڈولی 'لوٹری' 'اسیل' کا جھن 'جلین' جھن 'کھاری' 'پہنہاری' ان لڑکوں کا سروہ 'دروازہ' رہے گا۔ میری اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوان خانہ میں سے رہے گی۔ عیاذ اہلہ اوہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جائیں۔ اپنے بیگانے کو ہر وقت جھپٹائیاں نظر آئیں۔

بی و نادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں اب تمہاری چھوٹی نے انہیں 'دو فادار' ایک بنا دیا ہے۔ ہاں غلطی ہیں سودا تو کیا لائیں گی مگر خلق اور مفساد ہیں۔ دست چھتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پولند توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ

دکھا نہیں اور نہ کہیں کہ ”یہ بھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کالی کے اس“ (تمہارے چچا کے بیٹے کی کیا داری کے ہیں) ہے۔ ایسے عالی شان و بے ان خانے کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دلوانے کی یہ شامت امجد اس سردی کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں کے کتب کے لئے ہرگز کافی نہ جاتا۔ سو اور کچھ تر اور دنہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رو سکتے تھے؟ معرفت ربی طبع اعترافم پڑھا اور چپ ہو رہا۔ مگر تمہاری خاطر خاطر جمع رہے کہ اسباب وحشت و خوف و خطر نہ رہے۔ بند کھل گیا ہے۔ مکان کے مانگلوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ نہیں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کھانا چاندنی رات ہوا سرد تمام رات ٹھک پر سرخ پیش نظر دو گھڑی کے تر کے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا اور مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبحی کا وہ دلف روشنی کا وہ عالم۔

غالب

۶ اگست ۱۸۶۲ء

(۱۳)

میری جان! غالب کثیر المطالب کی کہانی سن۔ نہیں اسلئے زمانے کا آدمی ہوں۔ جہاں ایک امر کی ابتدا دیکھی ہے جان لیا کہ اب یہ امر مطابق اس ہدایت کے نہایت پندیر ہوگا۔ یہاں اختلاف طبائع کا وہ حال کہ آغا مفتوح انہام مقدوش۔ مبتدا خبر سے بیگانہ شرط جزا سے محروم۔ سنا اور متواتر سنا کہ قصہ طے ہو گیا۔ اب علاء الدین خاں مع ثبائل آئیں گے۔ دل خوش ہوا کہ اپنے محبوب کی شکل مع اس کے سارے کچھ دیکھوں گا۔ پرسوں آخر روز بھائی پاس گیا۔ انشاء اختلاف و انبساط میں نہیں نے پوچھا کہ کبھی علاء الدین خاں کب آئیں گے؟ جواب کچھ نہیں ”ابھی وہ قصہ تو طے ہو گیا؟“ ”ہاں وہ تو وہ ہے میں نے دے بھی دیا“ انہیں نے کہا تو اب چاہیے کہ وہ آئیں۔ فرمایا کہ ”شاید ابھی نہ آئے۔“

معلوم ہوا کہ خیر خیر کا

ناچار ارادہ کیا کہ جو کچھ کہنا تھا اب نہیں کہہ کر بھیجوں۔ پرسوں تو شام ہو گئی تھی۔ کل بنگلہ ہونے والوں نے دم نہ لینے دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ قہ نے کہا کہ بھائی تم سے شاک ہیں۔

اب ضرور پڑا کہ گزشتہ ارشاد عاسے پہلے قصار سے مدفع لحال میں نکال کر دیں۔
 بھائی! تم میرے فرزند بلکہ پادفرزند ہو۔ اگر میرا سلیبی بیٹا اس ویلہ دانست و تحریر و تقریر
 کا ہوتا تو نہیں اس کو اپنا یا دروفا وار اور ذریعہ انتقام جانتا۔ میرے شلوٹ کے نہ پہنچنے کا گلہ غلط۔ قصار
 کو نہ لفظ آیا کہ اس کا جواب یہاں سے نہ لکھا گیا؟ میرے پاس جو مقاصد ضروری فراہم تھے وہ
 نہیں نے اس نظر سے نہ لکھے کہ اب تم آتے ہو زبانی گفت و شنید ہو جائے گی۔ قاقب نے جلتی
 گاڑی میں روڈ ۱۱۱ کا دیا۔ تب مجھے تو طبعیہ تنہید میں ایک ورق لکھنا پڑا اور آنا زنگارش یہاں سے نہ
 ہوتا۔

یا اسد اللہ الطالب!

ہامن از جہل معارض شدہ تا مغلطے
 کہ گردش کجہ سکیم این بودش مدح عظیم
 یہ در سال موسوم بہ "عرق قاطع رہان" جو قاقب نے تم کو بھیجا ہے میرے کہنے سے بھیجا
 ہے اور اس ارسال سے میرا مدعا یہ ہے کہ اس کے معائنے کے وقت اس کتاب کی بے بدلتی عبارت
 پر اور میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے حدیثہ پر نظر نہ کرو بیگانہ وار و یکجہ وار از روئے انصاف حکم
 بخو۔ بے حیف و میل۔

اُس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں اس پر حصہ نہ کرو۔ غلطیاں عبارت کی۔ شدت الخطاب
 محل کی صورت سوال دیگر جواب دیگر۔ ان باتوں کو ملح نظر کرو۔ بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے
 تو ان مراتب کو الگ ایک کاغذ پر لکھو اور بعد اتمام میرے پاس بھیج دو۔ میرا ایک دوست روحانی کہ
 وہ مجھ سے رجال الغیب ہے۔ ان بغوات کا خاکہ اُزار ہے۔ غیر دشمنان نے اس کو مدد دی ہے۔ تم
 بھی بھائی! مدد دو۔

اور وہ امر مبہم کہ جو قصار سے والد کی تقریر سے دل نشیں نہیں ہوا یعنی قصہ چک جانا اور
 دلی آنا اس کا اجراء مفصل و شرح لکھو۔

دانا تاریخ کو اپنا نام آنا زنگارش میں لکھو آ یا ہوں۔ اب ارسال جواب کی تاکید کے سوا
 اور کیا لکھوں! فقط۔

چهارشنبہ ۱۸ مئی ۱۸۶۳ ع بقول عوام ہاسی عید کا دن صبح کا وقت۔

(۱۳)

اجلی سولا نا حلالی!

نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے اور یہ میں خبر تراشی نہیں کرتا، مرزا علی محمد بیگ کی زبانی ہے کہ نواب علاء الدین خاں سے کہہ چکے کہ قصہ مٹ گیا ہے۔ اب تم شوق سے دلی جاؤ۔ دو مہینے سے لیکر دو مہینے تک کی تم کو رخصت ہے۔ پھر تم کیوں نہ آئے؟ خدا نے دعا خداوند نے استدعا قبول کی، تمھاری طرف سے ست قدی اور دل سردی کی کیا وجہ؟ اگر حاکمی کی حکایت جھوٹ ہے تو تم سچ لکھو کہ ماجرا کیا ہے۔

مرزا یوسف علی خاں عزیز، تمھارے بلائے ہوئے اور مہدی حسین، بھائی صاحب کے مطلوب، مرزا عبدالقادر بیگ کے قبائل کے ساتھ کل روانہ ہو رہے ہیں۔

شعبہ ۱۸۶۳ء
نہایت کا طالب، غالب

(۱۵)

میری جان! نا سازی روزگار و بے ریلٹی اطوار، بطریق داغ بالائے داغ، آرزوئے دیدار۔ وہ دو آتش شرارہ ہار اور یہ ایک دریائے ناپیدا کنار۔ وقت رہنا عذاب کنار۔

خدا نے بھائی ضیاء الدین خاں کے بڑے حابے پر اور میری بیکی پر دم فرمایا۔ میرا شہاب الدین خاں سچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا۔ یواسیر خونی، زحیر، چپ، صداع، بارے اب من کل الوجوه صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جائے گا۔ آگے کون قوی تھے کہ اب ان کو ضعیف کہا جائے؟ ایک بڑا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا، "ہائے بڑے حابا!" ادھر ادھر دیکھا، جب جانا کہ کوئی نہیں ہے، کہتا ہوں بڑے حاکر، "جراتی میں کیا پتھر پڑتے تھے"۔ اسلام جنوری ۱۸۶۵ء

غالب مستہام

(۱۶)

چانا حالی شانا!

خط آیا۔ خط اٹھایا۔ تمھاری آشتی حالی میں ہرگز شک نہیں۔ تم کہیں، قبائل کہیں۔ والی شہرنا سازگار، انجم کارنا پامدار، ایک دل اور سوا قرار، اللہ تمھارا یادو، علی تمھارا مددگار۔ میں پاور رکاب، بلکہ فصل

ور آتش۔ سب جاؤں اور فلک سیر کو دیکھوں۔ ایک خط نہیں نے علی حسین خاں کو لکھا۔ وہاں سے اس کا جواب آ گیا۔ دو بیچا پھوڑے بھنسی میں جتا ہے۔ خدا اُس کو صحت دے۔ شہزاد علی بیگ کہاں اور پانچا اور اس طرح گیا کہ شہاب الدین خاں سے مل کر بھی نہ گیا۔ خیر!

دوسرے مصلحت غولیش خسرواں دانہ

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس کے فاصلے پر آغا پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خلیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کشن بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میوں کے آئے اور غیموں میں اترے۔ کچھ کم سو صاحب اور ہم جمع ہوئے۔ سب سرکار رام پور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور نے نور پور سے قتل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ اور بارہ پر دو بجے گئے شام خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں خانساں خواہی میں سے دو پہ پہنکنا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ تار ہوا ہو گا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ چمن شام کا کھانا نہیں کھائیں گے۔ روشنی آسمانی کی وہ افراط کدرات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ جھوم اکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف اسلوک کہا جاوے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کشن بہادر مع صاحبان عالی شان کے کل جائیں گے۔ کوئی کہتا ہے پرسوں۔ دیکھیں! کی تصویر کھینچا ہوں۔ قد رنگ شکل شکل حمید ضیاء الدین خاں۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور کچھ تفاوت۔ علیم، خلیق، بادل، کریم، متواضع، متشہر، متورع، شعر فہم۔ سیکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ ہلالائے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ گفتہ جنہیں ایسے کہان کے دیکھنے سے غم کوں بھاگ جائے۔ فصیح جان ایسے کہان کی تقریریں کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اللہم دام! قابل و زہد ارجل بعد اختتام محافل طالب رخصت ہوں گا۔ بعد حصول رخصت و قی جاؤں گا۔ بھائی صاحب کی خدمت میں بشرط رسائی و تاب کو یابی سلام کہنا اور بچوں کی خیر و عافیت جو ہم کو معلوم ہوئی ہے وہ مجھ کو لکھنا۔ ۶ دسمبر ۱۸۶۵ ع کی بدھ کا دن آٹھ بجایا ہے۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانئے ہو گے۔

(۶ دسمبر ۱۸۶۵ ع)

(۱۷)

مرزا

رو برو پاز پیلوآ کو میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع چودہ مرغ چھ بڑے اور آٹھ چھوٹے کے دُئی کو روانہ ہوئے۔ دو آدھی میرے اُن کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیا زعلی یعنی ڈنچ آدھی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے بوقت رخصت ایک ایک دو شالہ مرحمت کیا۔ مرزا نعیم بیگ اور مرزا کریم بیگ دو ملتے سے یہاں واپس ہیں اور اپنی بہن کے پاس ساکن ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے ساتھ دُئی چلوں گا اور وہاں سے لوہارو جاؤں گا۔ میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی ہفت چلوں گا۔

آپ چال چو کے۔ اردو لکھتے لکھتے جو خط مشغل ایک مطلب پر تھا اس کو تم نے فارسی میں لکھا اور فارسی بھی حصہ یا نہ کہ میر کو اور اپنے بزرگ کو کبھی بھیضہ مفرود نہ لکھیں۔ یہ وہی چھوٹی "ہے" بڑی "ہے" کا قصہ ہے۔ خیر خط نہ دکھائیں گا۔ مکتوب یہ کہہ کر کام نکال لوں گا۔ نہیں نے تو چلتے وقت مرغ میر کے اتالیق کی زبانی یہائی کو کہنا بھیجا تھا کہ تم اگر کوئی اپنا خاکہ تو نہیں اس کی درستی کرتا لاؤں۔ جواب آیا کہ اور کچھ نہ حاضر نہیں۔ صرف مکاتوں کا مقدمہ ہے۔ سو اس مقدمہ میں میر اور میرے شرکا کا وکیل وہاں موجود ہے۔ اگر وہ اس امر کا ذکر کرتے تو نہیں ان سے ان کے خاویں اصغر خاں کے نام عرضی یا خط لکھوا لاتا۔ بہر حال اب بھی قاصر نہ ہوں گا۔ تاریخ اوپر لکھا آیا۔ نام اپنا بدل کر مغلوبہ دکھایا ہے۔

(جمادی الثانی ۱۲۷۵ھ بمطابق ۱۸۶۵ء دو بجے تین کا عمل)

میرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب

(۱۸)

مرزا میاں شہاب الدین خاں ابھی طرح رہو۔ غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہو گا۔ بیٹے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راضی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوئے رہوں۔ وہاں کاٹے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں بر خوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دئے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو چلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چٹنا تک بھر گئی داغ کیا۔ دو شامی کہاب اس میں ڈال دئے۔ رات ہو گئی تھی 'شراب' پنی کہاب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھجری بکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سداہ سالن بکوا دیا۔ ترکاری نڈا لوائی۔ ہارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس میں صلح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپن اور مشائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔ آج میں نے حمداے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار پانچ بیجے کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے ہاپوڑ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چار پائی بچھائی اس پر بچھوٹا بچھا کر حقہ پیا رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کو حل آ گئے۔ دونوں لڑکے اتھو میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھالیا اور چلے۔ تم اپنی اُستانی کے پاس چاکریہ قعدہ سراسر چڑھ کر تادینا۔ شمشاد کو کتاب اکے مقابلے اور تصحیح کی تاکید کر دینا۔

(غالب)

میرزا قربان علی بیگ خاں سالک

(۱۹)

میری جان! کن لوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو عید چکا! اب بچا کو بھی رو۔ خدا
تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت دے دی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع پاتی
نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ کما ثنائی بن گیا ہوں۔ رنج و زلت سے خوش ہوتا
ہوں۔ یعنی نہیں نے اپنے کو اپنا طیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں: لو! غالب کے
ایک اور جوتی تھی۔ بہت اتراتا تھا کہ نہیں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا
جواب نہیں۔ لے! اب تر خدا روں کو جواب دے۔ کچ تو یوں ہے! غالب کیا مرا! بڑا طحہ مرا! بڑا کافر
مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے ”جنت آرام گاہ“ و ”عرش نشین“ خطاب دیتے
ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قہر و بخت جانتا تھا، ”سز سقر“ اور ”ہو یہ زلویہ“ خطاب جموین کر رکھا ہے۔
”آئے غم اللہ و بہادر!“ ایک تر خدا کا گریباں میں ہاتھ! ایک تر خدا ہو گ سار ہا ہے۔ نہیں
ان سے پوچھ رہا ہوں: ”امی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے! اور ظان صاحب! آپ
سلوٹی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا ہے حتمی ہو رہی ہے؟ کھو تو اکسو! کچھ تو یو! لالو! بولے کیا ہے حیا! بے
غیرت! کوٹھی سے شراب! گندھی سے گلاب! بڑا از سے کپڑا! سید! فردش سے آم! صرف سے دام
قرض لئے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا! کہاں سے دوں گا۔

(۲۰)

واللرحمن الطاف فظیہ۔ خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی۔ دم قضیت ہے۔ جان ہے تو
جہان ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا سے ناامیدی کفر ہے۔ نہیں تو اپنے باب میں خدا سے ناامید ہو کر کافر
مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہل اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھی
نہ دیا! ندین۔ مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو! اور خدا سے ناامید نہ ہو۔ اہل معاصر میرا کو اپنا
نصب العین رکھو:

در طریقت ہرچہ بخش سالک آید خیر دوست

مگر میں تمہارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ محمد میرزا بخشیدار جمو کو داستان کے

وقت آ جاتا ہے۔ رمضان ہر شب کو روز آتا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز سلام اور باقر اور حسین علی بندگی کہتے ہیں۔ کچھ دھوکہ کورٹش عرض کرتا ہے۔ اوروں کو یہ پایا حاصل نہیں کردہ کورٹش بھی بچا لائیں۔ خط بھیجے رہا کرو۔ والدہ کا

اپنی مرگ کا طالب غالب

صبح روشنبہ ۶ صفر سال حال (۱۲۸۷ھ)

۱۱ جولائی ۱۸۶۳ ع

منشی ہرگوپال تفتہ

(۲۱)

کیوں مہاراج کول میں آتا اور منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرتی اور ہم کو یاد دلانا! مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیونکر جانا کہ تم مجھ کو بھول گئے؟ کول میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی۔ نہ لکھا نہیں کیونکر آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور ہاں صاحب اسے کہاں چالوں گا۔ خیر! اب جو نہیں نے بے حیائی کر کے تم کو خط لکھا لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو۔ تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں باہو صاحب کی میرے پاس موجود ہیں اور اصلاح پانچگی ہیں۔ اب نہیں حیران ہوں کہ کہاں بھیجوں۔ ہر چند انھوں نے لکھا ہے کہ اکبر آباد ہاشم علی خاں کو بھیج دو لیکن میں نہ بھیجوں گا۔ جب وہ اجیر یا ہجرت پر پہنچ کر مجھ کو خط لکھیں گے تو میں ان کو وہ اوراق ارسال کر دوں گا یا تم جو لکھو گے اس پر عمل کروں گا۔ بھائی ایک دن شراب نہ بیچ یا کم بیچ اور ہم کو وہ چار سطریں لکھ دیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔

اسد اللہ

رقم زدہ یک شنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۲ ع

(۲۲)

کاشانہ دل کے ماہود ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ۔ تحریر میں کیا کیا سحر طرازیوں کرتے ہیں۔ اب ضرور آ پڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زمین

الحاجدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بیٹے کہ وہ میرے پوتے ہیں میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو سنا رہے ہیں اور نہیں قفل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیجئے، نکلے نکلے پاؤں میرے چنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھکتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں نہیں نکل آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں، میں کیوں گھبراؤں گا؟ آپ ان کو جلد بہ کمال ذاک میرے پاس بھیج دیجئے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ بھر جلد ان کو تمہارے پاس بہ کمال ذاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمہارے عالم صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت رکھے اور تمہارے معنوی بچوں یعنی نتائج طبع کو فروغ، شہرت اور حسن قبول عطا فرمائے۔

بابو صاحب کے نام کا خط ان کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے، ان کو دے دیجئے گا۔ اور ہاں صاحب بابو صاحب اور تم آج کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخ روانگی لکھ بھیجنا تاکہ میں بے خبر نہ رہوں۔ واللہ

لکاشتہ جمعہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ ع

اسد اللہ

(۲۳)

بھائی!

ہاں نہیں نے ”زبدۃ الاخبار“ میں دیکھا کہ رانی صاحبہ مرغیں۔ کل ایک دوست کا خط اکبر آباد سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ کدہ مرآۃ رانی مری، ابھی ریاست کا کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ صورت انتظام جانی بیج تاحہ کے آنے پر متوقف ہے۔ یہاں تک اس دوست کی تحریر ہے۔ ظاہر اس کو بابو صاحب کا نام نہیں معلوم۔ ان کے بھائی کا نام یاد رہ گیا۔ صرف اس دوست نے بطریق اخبار لکھا ہے۔ اس کو میری اور جانی جی کی دوستی کا بھی علم نہیں۔ حاصل اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر یہ خراج ہے تو تمہارے دوست کا نام بتا رہے گا۔ آمین یا رب العالمین۔

صاحب، بے پور کا مقدمہ اب لائن اس کے نہیں ہے کہ اس کا خیال کریں۔ ایک بنا ڈالی تھی، وہ نہ اٹھی۔ راجا لڑکا ہے اور چھوڑا ہے۔ راول جی اور سعد اللہ خاں بنے رہتے تو کوئی

بات نکل آتی اور یہ جو اب آپ کہتے ہیں کہ رجبہ تیرے دیوان کو پڑھا کرتا ہے اور پیش نظر رکھتا ہے۔ یہ بھی تو آپ اذروے تغریب شئی برویہ لکھتے ہیں۔ لکن کایان کیوں کر دل نصیب ہو؟ وہ بھی جو بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپے نقد اور طلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے ہولی ہو بھی اور نہیں لے کر چلا۔ چاگن، جیت، جوساکھ، نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے آگے تو چاگن میں ہوتی تھی۔

بندہ پورن بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہندو یاں بھیجی ہیں سوسورو پے کی۔ ایک تو میرا احمد حسین میکش کے واسطے راجا صاحب کی طرف سے 'تاریخ' تو لکھ کر دو صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو بطریق نذر شاگردی۔ بعد اس کے دو ہندو یاں سوسورو پے کی بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں۔ مع میرا احمد حسین کے مصلے کے روپیوں کے۔ چار سو اور اس کے علاوہ تین سو گورہ یہ کہ چار سو یا تیس سو کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر کے حوالے ہے۔ اگر دو سو برس کے ہیں تو دو برس میں اور اگر تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

ہاں صاحب یہ وہی میرا قاسم علی صاحب ہیں جو میرے پرانے دوست ہیں۔ ہر سوں یا اتر سوں جیڑا اک کا ہر کارا جھارا خط لایا تھا۔ وہ ایک خط میرا صاحب کے نام کا، کوئی میاں نکلتا اللہ ہیں، ان کا میرے مکان کے چتے سے لایا تھا۔ وہ نہیں نے لے کر رکھ لیا ہے۔ جب میرا صاحب آ جاویں تو ان کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ حضرت اگر میرے واسطے نہیں، تو اس خط کے واسطے آپ دہلی آئے۔

غالب

(۲۳)

حصاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔ بھائی کا ہاتھ اس سے آنا معلوم ہوا۔ آویں تو میرا سلام کہہ دیتا۔

یہ حصارا دعا گو اگر چہ اور اسود میں پایہ عالی نہیں رکھتا، مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے، یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں مہری بیاس نہیں بھیجتی۔ حصاری دست پر سو ہزار آفرینا۔ بے پھر سے اگر مجھ کو دو ہزار آجھ آ جاتے تو میرا قرض رخص ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس

کی زندگی ہوتی ' تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی تمھاری جان کی قسم منکرات میں جا کر سولہ سو بیچ رہیں گے سود میرے صرف میں آئیں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بھدر پندرہ سولہ سے کے باقی رہے گا اور وہ جو سو بابو صاحب سے منگوائے گئے تھے وہ صرف انگریز سوداگر کے دینے تھے قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمھارے مشرب میں حلال ہے۔ سودہ دینے گئے۔ یقین ہے کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط مع ہنڈوی آ جائے۔ بابو صاحب کے جو خطوط ضروری اور کوافٹ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ وہ نہیں نے پنجشنبہ ۲۶ مئی کو پارسل میں ان کے پاس روانہ کروئے اور اس میں بھی لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور میرے پیسے ہوئے لفافے جلد بھیج دو۔ پنجشنبہ پنجشنبہ پندرہ دن آج پورے ہوئے۔

(غالب)

(۲۵)

بھائی!

جس دن تم کو خط بھیجا ' تیسرے دن ہر دیو سنگھ کی عرضی اور بچیس روپے کی رسید اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے؟ بابو صاحب نے بچیس روپے ہر دیو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے بھرانہ لئے۔ یہ ہر حال ہنڈوی بارہ دن کی سیعادی تھی۔ چند دن گزر گئے تھے چھ دن باقی تھے۔ مجھ کو پھر کہاں؟ حتیٰ کاٹ کر روپے لے لئے۔ قرض منقرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس سینٹا لیس ہفتہ بکس میں اور چار بوسل شراب اور تین شیشے گلاب کے خوش خانے میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علی احسان۔

بھائی صاحب آگئے ہوں تو میرا قاسم علی خاں کا خط ان کو دے دو اور میرا سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو کہ میں ان کو خط لکھوں۔ بھائی صاحب بھرت پورا جائیں تو آپ کا بلی نہ کیجئے گا اور ان کے پاس جاسیئے گا کہ وہ تمھارے جو پائے دیدار ہیں۔

اسد اللہ

سرخنبہ ۲۳ جون ۱۸۵۳ ع

(۲۶)

بھائی!

میں نے بابا تمھاری شاعری کو نہیں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو قلعہ خن سے فرصت نہ ہو گی۔ پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیح کی صنعت کا اور دولت شعر کہنے کا اس میں ضرور نشست معنی بھی ملحوظ رکھا کرو اور جو کھوس کو رو بار و بار دیکھا کرو۔

کیوں صاحب، یہ ذیل خط پوسٹ پیڑ بھیجا اور وہ بھی دلی سے سکندر آباد کو آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہو گا؟ کیا فنی آتی ہے تمھاری باتوں پر۔ خدام کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو تم کو دے۔ جانی جی کی بڑی فکر ہے۔ میں تم کو لکھا چاہتا تھا کہ ان کا حال کھسو۔ تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں۔ یقین ہے کہ اجیر میں ہوں گے مگر خط نہیں بھیجا جاتا کہ وہاں مقیم نہیں ہیں۔ خدا جانے کب مل سکیں۔ بہر حال تم بھرت پور کے قریب ہو اور ان کے متوسلوں کو جاننے ہو اور اگر ہو سکے تو کسی کو لکھ کر خبر منگو الوداد جو کچھ تم کو معلوم ہو وہ بھی مجھ کو لکھو۔ فنی صاحب امین فنی عبداللطیف کول میں آگئے۔ کل ان کا خط مجھ کو آیا تھا۔ آج اس کا جواب بھی روانہ کر دیا۔

اسد اللہ

یک شنبہ ۲۱ اگست ۱۸۵۳ ع

(۲۷)

فنی صاحب!

تمھارا خط اس دن یعنی کل بدھ کے دن پہنچا کہ میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے کھانا مطلق نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میرے اور نہ رات کو شراب۔ حرارت مزاج میں بہت ہے ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے۔ ہرگز بھوک نہیں لگی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ بابو صاحب والا مناقب کا خط تمھارے نام کا دیکھا۔ اب اس ار سال میں وہ آسانی نہ رہی اور بندہ دشواری سے بھاگتا ہے۔ کیوں تکلیف کریں؟ اور اگر بہر حال ان کی مرضی ہے تو خیر میں فرمان پذیر ہوں۔ اشعار سابقہ و حال میرے پاس امانت ہیں ابدا جیسے ہونے

کے ان کو دیکھوں گا اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سہولتیں مجھ سے بہ ہزار جزئیں انکسپی مٹی ہیں۔

روز پنجشنبہ ۱۸۵۳ ع

اسد اللہ

(۲۸)

صاحب!

دیباچہ و تقریر کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھڑاتے ہو؟ اگر دیوان جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ۔ آ کے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے۔ نہیں کہاں تک دیباچے لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ اور باغی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جائے دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔ صاحب! جہاں تقاضا میں الف نہ ملے وہاں کیوں کہو؟

(۱۸۵۵ ع)

اسد

(۲۹)

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک ختم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات میر و محبت و رفیقش آئے۔ شعر کہے دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تہا رہے دوست دلی تھے اور فطرتی نبی بخش ان کا نام اور حقیر و حقیر تھا۔ ناگاہ وہ زمانہ نہ رہا، خود وہ معاملات، خود وہ اختلاط، خود وہ انجساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا ختم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس ختم کی ہیئت مثل پہلے ختم کے ہے۔ یعنی ایک خطائیں نے فطرتی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ فطرتی ہر کو پال اور مختص بہ نقل ہو آج آیا اور نہیں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے، لیکن ایک دوست اس ختم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ و صوفی نے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ خود اہلہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو تو کیوں کر ممکن قدم میں بیٹھا ہوا؟ صاحب بندہ نہیں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بد دیوار ہیں گھر ٹیکسوں کے اور دلوں کو کر ہیں راجا نند سنگھ بہادر والی پٹیا لہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقت عمارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ نہیں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جانتا! امیر 'غریب سب نکل گئے۔ جوروہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار نہیں دار دولت مند اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ منسلح حالات نکلتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ ہانڈس اور دارو گیر میں جھلا ہیں مکر و دھوکہ جو اس ہنگام میں لوگوں کو ہوئے ہیں اور ہنگام سے میں شریک نہ رہے ہیں۔ نہیں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھتے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو کوئی کرسی سمجھو، خرابی مزدوری جانو۔ اس فقیر آ خوب میں کسی مصلحت میں نہیں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا آوار ہا اور نظرائی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو مظلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے باخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہذا اعلیٰ نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی۔ فرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ محرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیل بندہ دست یاز و ام مٹی سے آج تک یعنی شنبہ و جمعہ و سہرے ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں بلکہ خود ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں سے باہر اندر کوئی بغیر گٹ کے آنے جاتے نہیں پاتا۔ تم زہار یہاں کا امرا وہ نہ کرتا۔ ابھی دیکھنا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہر حال مٹی صاحب کو میرا اسلام کو نہا اور یہ خط دکھا دینا اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہر کارے کو دے دیا۔

(غالب)

شنبہ و جمعہ ۱۸۵۷ء

(۳۰)

آج سچیر (ہفت) کو دو پہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمھارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو یاد دہا کر ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔ میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آ کر کیا کرو گے؟ جنگ گھر میں سے خدا کرے تمھارا روپیہ مل جائے۔

بھائی میرا حال یہ ہے کہ دفتر شادی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی بھرنے پر نسبت میرے کوئی خبر بد خواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا شہر میں ہونا جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، مزد و پیش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا۔ دامد گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ گھر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں لایا۔ کسی حاکم کو نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی کو درخواست نہیں کی۔ مٹی سے غصن نہیں پایا۔ کوئی دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انہام بکھر نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں، گھر زندہ گی و بال ہے۔ ہر گونہ سگھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔ والد دعا

قالب

روز شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۸ء وقت ضرورت

(۳۱)

صاحب! کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی؟ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمھارے خط میں مولوی قمر الدین کا سلام بھی آیا اور بھائی فشی نبی بخش کی خبر و عالیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو ملتان کے فکر میں تھے۔ ظاہر اویں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالیٰ ان کی جو مراد ہو بر لائے۔ ان کو میرا سلام کہہ دینا۔ ہلکے یہ رقتہ پڑھوادینا۔ مولوی قمر الدین خاں کو بھی میرا سلام کہنا۔

تم اپنے کلام کے پیچھے میں مجھ سے پُرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو ہیں تو میں جزو ہیں تو بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعر غنی شاہ نہیں رہا، صرف غنی فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح سچ بتانے کی گویا ہوں۔ بھلاؤ نہ سمجھنا، شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام

دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔ قصہ مختصر وہ اجڑا جلد بھیج دو۔

غالب

یک شنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ ع

(۳۲)

کیوں صاحب اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی؟
مرزا صاحب ہی آئے، خوشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں ایک ہارشی شیونرائن صاحب نے
کرم کیا تھا اور خط میں رقم کیا تھا کہ اب ایک فرم باقی رہا ہے۔^۱ اس رسالے میں یہ تصور کر رہا
ہوں کہ اگر ایک فرم منتر باقی تھا تو اب قصیدہ چھاپا جاتا ہو گا اور اگر فرم قصیدہ کا تھا تو اب جلد میں غنی
شروع ہو گئی ہوں گی۔

تم سمجھے؟ نہیں تمہارے اور غشی نجی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے
خطوط کے آنے کو تمہارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر کو یاد وہ مکالمہ ہے جو پام ہوا کرتا ہے۔ پھر تم
کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے؟ اور کیا دیر ہے؟ اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟ بھائی صاحب کو کاپی کی تصحیح
سے فراغت ہو گئی؟ مرزا صاحب نے جلد میں صحاف کو دے دیں؟ اب میں ان کتابوں کا آنا کب
تک تصور کروں؟ دوسرے میں ایک دو دن کی تعطیل مقرر ہوئی ہوگی۔ کہیں دیوالی کی تاریخ تک
نو بہت نہ پہنچ جائے۔

ہاں صاحب! تم نے کبھی کبھہ حال قمر الدین خان صاحب کا ذکر نہ لکھا۔ آگے اس سے تم
نے اگست، ستمبر میں ان کا آگرے کا آنا لکھا۔ پھر وہ اکتوبر تک کیوں نہ آئے؟ وہاں تو غشی غلام
غوث صاحب اپنا کام بدستور کرتے ہیں، پھر یہ اس دفتر میں کیا کر رہے ہیں؟ کہیں کسی اور کام پر
مبصہ ہو گئے ہیں؟ اس کا حال جلد لکھو۔ مجھے کو یاد پڑتا ہے کہ تم نے لکھا تھا کہ غشی غلام غوث خاں
صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے۔ مولوی قمر الدین خان صاحب اس کے بندوبست کو آیا
چاہتے ہیں اس کا نظور کیوں نہ ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب جلد لکھیے۔ جناب مرزا صاحب کو میرا
سلام کہیے اور یہ پیغام کہیے کہ کتاب کا حسن کا نوں سے سنا دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا، مگر
آنکھوں کو دیکھنے سے کالوں پر اور کان چٹک دینی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو گیا آنکھوں
کا حق آنکھوں کو کب تک ملے گا؟ بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو

مجھ کو جلدی نہیں ہے۔ آپ کی تحفیف قصد رنج چاہتا ہوں، یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔ مثنیٰ شیونرائن صاحب کی عطا کتب کا شکریہ مری نہ پائی ادا کیجئے گا اور یہ کہجے گا کہ آپ کا خط پہنچا۔ چونکہ میرے خط کا جواب تھا اور معذرت کوئی امر جواب طلب نہ تھا اس واسطے اس کا جواب نہیں لکھا۔ زیادہ زیادہ۔

لکھنؤ درواں واشتہیچ شنبہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۸۵۸ ع

غالب

(۳۳)

کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ پہلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جائے۔ یہ ہر حال:

کس بشنود یا نضود من متفکونے کی قسم

کل جود کے دن ۱۲ تاریخ نومبر کی تینتیس جلدیں بھیجی ہوئی پر خوردار شیونرائن کی پہنچیں۔ کاغذ خط تقطیع 'سیای' چھاپا سب خوب، دل خوش ہوا اور شیونرائن کو عادی۔ سات کتابیں جو مرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں وہ بھی یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔ معلوم نہیں مثنیٰ شیونرائن نے امداد کو واسطے امید تھکے کے کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں۔

صاحب! تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے قصد کا حال لکھو۔ سکندر آباد کب تک رہو گے؟ اگر وہ کب چلاو گے؟

جواب طلب غالب

شنبہ ۱۳۔ نومبر ۱۸۵۸ ع

(۳۴)

مرزا تقی! تمہارا خط آیا۔ فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا۔ خدا فضل کرے۔ اگر تم اس راز کے اعتبار کو منع نہ کرتے تو بھی میرا شیدا ایسا الفت نہیں ہے کہ میں ان کو لکھتا۔ لکھتے ہیں کہ میرا مہر کے دو چار روپے زاد اکرم صرف ہو گئے تو کیا اندیشہ ہے۔ حال یہ ہے کہ میں نے ان سے استفادہ کیا تھا۔

انھوں نے مجھ کو لکھا کہ کتابوں کی دوستی میں بارہ روپے صرف ہوئے ہیں۔ محصول کی ایک رقم خفیف مگر تمہیں نے اپنے پاس سے دی تو اس کا مضامینہ۔ مجھ کو تمہارا قول مطابق واقع نظر آتا ہے۔ البتہ ان کے دو تین روپے اٹھ گئے ہوں گے۔

لالہ لنگا پر شاو شاو شخص اپنے کو تمہارا شاگرد بتاتے ہیں، مگر روایت کہتے ہیں۔ کئی دن ہوئے یہاں آئے اور ہائیکند بے مہر کی غزلیں اصلاح کو لائے۔ وہ دیکھ کر ان کے حوالے کر دیں۔

ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔ انہیں نے اب ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے اور ہاں بھی ایک قلم شاو اور ہے، مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ "دستو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید علاقائی نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ ان کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنری نڈ بھی خرید گئی ہوگی۔ کہا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ چیف کشتیہ پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنری نڈ اور ملکہ کی نڈ اور سکریٹریوں کی نڈ یہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے۔ دیکھوں چیف کشتیہ کیا لکھتے ہیں اور گورنری کیا فرماتے ہیں:

تا نہال دوستی کے برہمہ حالیہ رقیم و حلقے کا شمیم
شعبہ ۳۸۔ نومبر ۱۸۵۸ ع

ناب

(۳۵)

صاحب

تمہارا خط آیا۔ میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امر اسٹیک کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے شک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ وہ ہارن کی چیز ہاں کٹ چکی ہیں ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پہاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ تو پھندا ہی

نوٹا ہے 'نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ نہیں تیرے بچوں کو پال لوں گا تو کیوں بلا میں پہنستا ہے؟

وہ جو صریح تم نے لکھا ہے وہ حکیم سنائی کا ہے اور وہ نقل "حدیث" نہیں مرقوم ہے:

پھرے ہا پھر بزاری گفت کہ مرا یار شو بہ ہرہ ہفت
گفت پایا زنا کن و زن نے ہند از خلق کیر و از من نے
ور زنا کر گیکرہت حسے ہند کو گرفت چوں تو ہے
زن کنی ہرگزت رہا نہ کند ور تو نگواریش چہا نہ کند

بس تو اب تم سنگد آہاد میں رہے، کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنگ گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں نہ میرے بھانے کو ملے ہے نہ تمہارے بھگنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے۔ جڑوٹا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کہو کیا جائے کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عہد القادریڈل نے خوب کہا ہے:

دھیت جاہ چہ و نظرت اسباب کلام
زین ہوسہا گور یا نگور سے گزرو

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور نہ سحرست نہ خوش نہ ناخوش نہ مردہ نہ زندہ۔ جئے جاتا ہوں۔ ہاتھ کئے جاتا ہوں روٹی روز کھاتا ہوں شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے۔ جو تقریر ہے پیکل حکایت ہے۔ ہارے جہاں رہو جس طرح رہو ہر جگہ میں ایک ہاریٹ لکھا کرو۔

یک شنبہ ۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ع غالب

(۳۶)

دیکھو صاحب!

یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ع کے خط کا جواب ۱۸۵۹ع میں بھیجے ہو اور حرا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ نہیں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔ لطف اس میں

ہے کہ نہیں بھی سچا اور تم بھی سچے۔

آج تک رائے امید سنگھ نہیں میں اور ابھی نہیں جائیں گے۔ تمہارا دعا حاصل ہو گیا ہے۔ جس دن وہ آئے تھے اسی دن مجھ سے کہہ گئے تھے۔ نہیں نہول گیا اور اس خط میں تم کو نہ لکھا۔ صاحب دہر مانتے تھے کہ نہیں نے کئی جگہ مرزا قلی کے دیوان کے اور کئی نسخے ”تخصیص اشعار گلستان“ کے ان کی خواہش کے بموجب کوئی پارسی ہے، یعنی میں اس کے پاس بھیج دے ہیں۔ یقین ہے کہ وہ ایران کو اور سال کر دے گا۔ امید سنگھ نے اس پارسی کا نام بھی لیا تھا۔ نہیں نہول گیا۔ اب جو تم کو اس خیال میں جھٹکا پایا تو ان کا بیان مجھ کو یاد آیا۔ جانتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ وہ پار ان کے گھر بھی گیا ہوں۔ مگر محلے کا نام نہیں جانتا۔ نہ میرے آدمیوں میں کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر تم کو لکھ بھیجوں گا۔

میر بادشاہ سے عند المآلات میری دعا کہہ دینا۔

لَا تُخُونِي وَلَا تُؤَدِّ الْأَيْمَانَ - کہنے کے قابل بات بھر نہول گیا۔ کل میر کرامت علی صفا تھیں کہ نہیں نے آگے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ناگاہ مجھ سے آکر ملے اور تمہارا پوچھتے رہے۔ نہیں نے کہہ دیا کہ بخیر و عافیت سکندر آباد میں ہیں۔ جب نہیں نے ان سے کہا کہ کیا وہ تمہارے آشنا ہیں؟ انھوں نے کہا: صاحب وہ بزرگ اور استاد ہیں نہیں ان کا شاگرد ہوں۔ کہیں در سے کے ملاتے میں لو کر ہیں۔ یہ سبیل ڈاک یہاں آئے تھے اور آج ہی سبیل ڈاک انہا لے کو گئے۔ انہا ان کا وطن ہے اور وہ ابھی دہلی ضلع میں ہیں۔

غالب

لکھنؤ، ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء

(۳۷)

صاحب!

ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ یہ خرد واد میر بادشاہ آئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے۔ تمہارا حال سن کر مجھ کو رنج ہوا۔ کیا کروں نہ اپنے رنج کا چارہ کر سکتا ہوں نہ اپنے عزیزوں کی خبر لے سکتا ہوں:

ہر آنچہ ساقی ما ریخت بین الطاف است

آج چہ قہادن ہے یعنی منگل کے دن کوئی پہر بھردن چڑھا ہو گا کہ راجا امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔ پوچھا کیا کہ کہاں سے آئے ہو؟ فرمایا کہ آگرے سے آتا ہوں۔ ”بہادون کی گلی“ میں جو ”بھیکسوں کی گلی“ کے قریب ہے ”جورس صاحب“ کی کوٹھی انہوں نے مول لی ہے اور اس کے قریب کی زمین افتادہ بھی خریدی ہے اور اس کو بھلا سے ہیں۔ حصارا نہیں نے ذکر کیا کہ ہر خط میں تم کو پوچھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں نے کئی خط بھیجے۔ جواب نہیں آیا۔ بولے کہ ایک خط ان کا آیا تھا اس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ پھر ان کا کوئی خط نہیں آیا۔

بہر حال میرے پھوڑے نکل رہے ہیں۔ نہیں باز دیہ کو نہیں گیا۔ شاید آج وہ مگے ہوں یا جاویں۔ پھر اکبر آباد کو جائیں گے۔ نہیں آج آ دی ان کے پاس بھیجوں گا۔ کل مرزا حاتم علی مرکا خط آیا تھا۔ تم کو بہت پوچھتے تھے کہ آیا میرزا اللہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ بھائی ان کو خط لکھ بھیجو۔

غالب

محررہ ۱۷ جون ۱۸۵۹ ع

(۳۸)

میاں!

تھمارے اشتاالات ذہن نے مارا۔ نہیں نے کب کہا تھا کہ تمہارا کام اچھا نہیں؟ نہیں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی خن فہم و قدر دان نہ ہو گا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشق خن کر رہے ہو اور نہیں مشق ذہن میں مستغرق ہوں۔ یوٹلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موبوم جاعتا ہوں۔ زینت بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سے راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گناہ مینے تو کیا؟ کچھ وہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی۔ باقی سب وہم ہے اسے یاد جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے۔ مگر نہیں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جائے عالم ہیرنگی

میں گزر پاؤں۔ جس سٹائے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو یہی سچی برکت دیا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ وہ یا نہیں ہے خراب ہے۔ سستی نہیں پندر ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدیؒ حافظؒ کے برابر مشہور ہیں گے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا؟

قطعات تاریخ آگرے کیونکر سمجھوں؟ پھر تمہارے پاس سمجھتا ہوں۔ ”خالق معنی معنی“
 ”معنی آفریں“ صحیح اور مستقیم اور جائز لیکن جس طرح اللہ میں مشہود لام کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے اللہ اور الہی میں الف محدودہ کو دوسرا الف کیونکر سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا اتفاق سلف شرط ہے۔ جب اور کسی نے الہی میں دو الف نہیں مانے تو ہم کیونکر مانیں؟

”دویم“ ”دروژن“ ”جویم“ ”للاط“ ”دوم“ ہے بغیر تحتانی۔ بالفرض تحتانی بھی نکلیں گے تو ”دویم“ ”دویم“ کے اگرچہ نکلیں گے دویم۔ دو کا اعلان کھال ہا ہر ہے۔ ہاں ”دوی“ درست ہے مگر نہ حذف تحتانی، نہ ”نوی“ نہ حذف نون (زمین) بلکہ بطریق قلب بعض ”دویم“ کا ”دوی“ ہو گیا۔ کنوے کی تاریخ کو بے تامل صحیح دو اور تاریخ وفات کا اور مادہ سو چڑ کس واسطے کہ جب الہی میں سے ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائے گا۔ والد عا

روڈ درود نامہ بعد خواندن نوشتہ شد۔ یک شنبہ
 از غالب

(۳۹)

صاحب!

تمہارا خط آیا حال معلوم ہوا:

جہانیاں ز تو بر گشتہ اند اگر غالب

ترا چہ پاک؟ خداے کہ دہشتی داری

خدا کے واسطے میرے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے؟ چہ نسبت بحکیم حسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الہی بخش جو شہزادوں میں ہیں ان کو حکم کراچی

بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھیے کیا ہو؟ حکیم جی کو ان کی حوصلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں چار ہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہائیں:

تو نکلی و غریبی ترا کہ ی ہند

نہ جزا نہ سزا نہ فرس نہ آفریں نہ عدل نہ ظلم نہ لطف نہ قہر۔ چند دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی اب صرف روٹی ملے جاتی ہے شراب نہیں۔ کپڑا لیا تم محکم کا بنا ہوا بھی ہے۔ اس کی فکر کچھ نہیں ہے۔ مگر تم کو میرے سر کی قسم یہ کچھ سمجھو کہ میری خیر تم نے کیا سنی؟ مجھے اس کے معلوم ہونے سے حرا ملے گا۔

غالب

شعبہ نمبر ۱۸۵۹ ع

(۳۰)

میری جان!

آخر لڑکے ہو یا ت کو نہ کہجے۔ نہیں اور آفت کا اپنے پاس ہونا نصیب نہ جانوں؟ نہیں نے یہ لکھا تھا کہ بشرط اقامت جانوں گا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری تو بے شمار رے خد ہوں گا، خد ہوں گا، زہار نہ رہوں گا۔ فشی ہا لکھ بے صبر کا خط بلند شہر سے دئی اور دئی سے رام پور پہنچا، تکف نہیں ہوا۔ اگر نہیں یہاں رہ گیا تو یہاں سے کورا گردئی چلا گیا تو وہاں سے اصلاح دے کر ان کے اشعار بھیج دوں گا۔ بے صبر کو اب کی بار میں پھر کا صبر چاہیے۔ وہ لفاظ بدستور لکھا ہوا ہے۔ اب تک یہاں کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں۔ فرصت مشاہدہ اور راق نہیں ملی۔ تم اسی رقعے کو ان کے پاس بھیج دیجئے۔

غالب

شعبہ ۱۳ فروری ۱۸۶۰ ع

(۳۱)

میرزا آفت!

اس فخر دگی میں مجھ کو ہنسنا تمہارا ہی کام ہے۔ بھائی "تصنیع گلستان" چھپا کر کیا

فائدہ اٹھایا ہے؟ جو اصطلاح ”سہلستان“ سے نفع اٹھاؤ گے؟ روپیہ جمع رہنے دو۔ آدھا بھی چیز ہے اگرچہ ٹھیکل ہو اور اگر روپیہ لینا منظور ہے تو ہرگز اتنا بیش نہ کرو اور درخواست دے دو۔ بعد نو مہینے کے روپیہ تم کو مل جائے گا۔ یہ میرا ذمہ کہ اس نو مہینے میں کوئی اختلاف واقع نہ ہوگا۔ اگر اٹھایا ہوا بھی تو ہوتے ہوتے اس کو مدت چاہیے۔ ”رستخیز بیجا“ ہو چکا۔ اب ہو تو رستخیز ہو۔ یعنی قیامت لوراس کا حال معلوم نہیں کہ کب ہوگی۔ اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی رستخیز کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں۔ احتمال فتنہ سال آئندہ ہر ہا سو بھی سو ہوم۔

میاں نہیں جو آخر جنوری کو رام پور چاکر آخرا رج کو یہاں آ گیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص والی رام پور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہو گا تو بھی پانچ ہزار روپے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گھنے تھے مگر نوکر نہ کھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر نہ کھلایا تھا۔ دو سو روپے مہینہ نہ دیا تھا۔ ثقافت گورنر آ آ ہا جو رام پور آئے اور ان کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب صاحب نے برطرف کر دیا۔ یہ تو سب سن لیا۔ اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب پوسٹ علی خاں بہادر اکتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گواہ گواہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے مہینہ ناہ بناؤ بیچتے ہیں۔ ہلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے وہ کر چلا آیا۔ بشرط حیات بعد برسات کے بھر جاؤں گا۔ دو سو روپے مہینہ یہاں رہوں، وہاں رہوں خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

غالب

۳۰ مارچ ۱۸۶۰ء

(۴۲)

بھائی! آج اس وقت تمہارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔ درمیان سال بھر۔ ہزاروں کہاں سے ہوتے۔ سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مدد خرچ ملے تھے وہ کٹ گئے۔ باقی دو سو مہنگات میں گئے۔ رہے دو ہزار روپے میرا اٹکار کار ایک بنایا ہے لہذا میں اس کا قرضہ ادا نہ کر سکتا ہوں۔ اب وہ دو ہزار (روپے)

لایا اس نے اپنے پاس رکھ لئے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کر دیا گیا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس (۲۶) ہوئے۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دے دو پانچ سو سات روپے ہاتی کے تم لے لو۔ نہیں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے 'تو سو باقی رہے 'آدمے تو لے لے آدمے مجھ کو دے۔ پر سوں چوتھی کو وہ روپے لایا ہے 'کل تک قصہ نہیں چکا۔ نہیں جلدی نہیں کرتا۔ دو ایک مہاجن بیچ میں ہیں۔ بیچے میں جھڑا فیصل ہو جائے گا۔ خدا کرے یہ خط تم کو پہنچ جائے۔ جس دن رات سے پھر کراؤ 'اسی دن مجھ کو اپنے درود و مسود کی خبر دینا۔ والد کا

شنبہ ششم مئی ۱۸۶۰ ع پکا مہرورد غالب

(۳۳)

اجی مرزا نقیہ

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈھویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر تخلیق کہ تم یہاں ہوتے اور نگاہات قلم کو چلتے پھرتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے سینے پائے پیرلیز جوتی ٹوٹی 'یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف 'سہلہ خان' ایک معشوق خیر ہے 'بد لباس ہے۔ ہر حال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دے دیں اور معلم کو حکم دیا کہ اس کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہو گیا۔
مرفوعہ صبح شنبہ ۱۹ مارچ ۱۸۶۱ ع غالب

(۳۴)

میرزا نقیہ

جو کچھ تم نے لکھا ہے 'یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ تم سے اور آرزو کی؟ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ نہیں ہندوستان میں ایک دوست صادق واللہ بدگمانتوں۔ جس کا ہر گو پال نام اور

تقدہ شخص ہے۔ تم ایسی کوئی بات کہو گے کہ موجب خال ہو؟ رہا نماز کا کہنا اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کُل ایک تھا۔ وہ ہمیں برس دو اندر کر مر گیا۔ مثلاً وہ بیٹا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری بھائی کہتا تو نہیں اس کو بھڑک دیتا اور اس سے آزرہ ہوتا۔ بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑے حاسب کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں بیٹہ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ معذرا یہ بھی ہے کہ اب عشقِ تمھاری پختہ ہو گئی۔ خاطر میری جمع ہے کہ اب اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں بکا راعنی نہیں۔ غیر کبھی دیکھ لوں گا۔ جلدی کیا ہے۔ تین بات جمع ہوئیں: میری کاملی تمھارے کلام کا تاج ہے۔ اصلاح نہ ہونا کسی قصیدے سے کسی طرح کے قطع کا تصور نہ ہونا۔ نظر ان مراتب پر کاغذ پڑے ہوئے۔ لالہ بالکنند بے صبر کا ایک پارسل آیا ہے کہ جس کو بہت دن ہوئے۔ آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی اس چندر وغزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب کو دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے یہ قصیدہ تمھارا کُل آیا۔ آج اس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا اس کو دیکھا اصلاح کیا آدمی کے ہاتھ ڈاک کمر بھجوا دیا۔

۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء غالب

(۳۵)

حضرت:

پرسوں صبح کو تمھارے سب کو اقد ایک لفافے میں بند کر کے ڈاک کمر بھجوا دئے۔ سمجھا کہ اب چند روز کو جان بچی۔ اسی دن شام کو ایک خط آپ کا اور پہنچا۔ اس کو بھی اردوانہ کرتا ہوں۔ اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصل لکھ چکا ہوں۔ اولیٰ بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں وہ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میرا لکھا ہوا میرا حال ہاؤر نہیں اور کسی نے جو کہ دیا کہ غالب کے پانو کا درم ایسا ہو گیا اور اب وہ شراب دن کو بھی پیتا ہے تو حضور نے ان باتوں کو یقین جانا۔ میں برس آگے یہ بات تھی کہ امرواں میں یا غش باز طعام یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب

شبانہ معمولی میں بھرانہ لیتا تھا اس میں برس میں برس برساتیں ہوتیں۔ بڑے بڑے مینہ برسے۔
 چنانچہ ایک طرف دل میں خیال بھی نہ گزرا بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہوگئی۔ پانچ کا درم حد سے
 زیادہ گزر گیا۔ مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا۔ کھولن شروع ہوگئی۔ سکھاء جو دو تین یہاں ہیں ان کی
 رائے کے مطابق کل سے نیب کا بھرتا بندھے گا۔ وہ پکالائے گا تب اس کو پھوڑنے کی تدبیر کی
 جائے گی۔ تھوڑی چھٹی زخمی۔ اگر وہ نامر وہ بے درد جھوٹا ہے تو اس پر لعنت اور اگر نہیں جھوٹا ہوں تو
 مجھ پر سو ہزار لعنت!

غالب

(۳۶)

جج ہے اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "نمودے استادان رنگ" کو کہاں سے سمجھتا:

پ از من نصیحت گرے ہایت نذاقم پس از من چہ غیش آیت
 میں نے جو لکھا کہ میں اچھا ہوں اس کو آپ جج سمجھ کر خدا کا شکر بجالائے۔ وہ جو میں نے لکھا تھا
 کہ شدت مرض کا بیان مبالغہ شاعرانہ ہے اس کو بھی آپ نے جج جانا ہوگا۔ حال آنکہ یہ دونوں
 نکلے اذرا دھڑکتے تھے۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملٹوں جانتا ہوں۔ کبھی جھوٹ نہیں
 بود۔ جب تم نے کسی طرح بیان واقعی کو یاد نہ کیا تو میں نے تمہیں لکھ بھیجا کہ اچھا ہوں اور یہ کلمہ
 تمہیں میں نے جب لکھا ہے کہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک دم میں دم دور ہاتھ میں جنبش قلم ہے جب
 تک موقع اصلاح خیال میں آسکتا ہے آج جو تمہارا دفتر پہنچے گا اس کو کل روانہ کر دیا کروں گا۔

معمولاً حال میرا یہ ہے کہ قریب مرگ ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں پھوڑے پانچوں میں
 درم۔ نہ وہ اچھے ہوتے ہیں نہ یہ دفع ہوتا ہے۔ جینے نہیں سکتا۔ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ کل تمہارا دو
 ورق آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اس کو دیکھ کر تمہیں بھجوا دیا۔ زہرا تم مجھے تندرست کہے جاؤ اور دفتر کے
 دفتر بھیجے رہو۔ ایک دن سے زیادہ توقف نہ کروں گا۔ قریب مرگ ہوں تو بلا سے۔

غالب

پنجشنبہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ ع

(۴۷)

لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے یہ سبب ذوق شعر و اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں
شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار نہیں لے تو بطریق قہر و دولتش بجان و رویش کھسا
تھا۔ جیسے ابھی جو روئے سے خاندہ کے ساتھ مرنا بھرتا اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ
ہے۔ (غالب)

(۴۸)

نور چشم غالب ' از غور رفتہ ' مرزا تقی
ندام کو خوش اور سحر مست رکھے۔ نہ دوست بخیل نہ میں کا ذب۔ مگر بقول میر تقی:
اتفاقات ہیں زمانے کے

یہ ہر حال کچھ تدبیر کی جائے گی اور انشاء اللہ صورت وقوع جلد نظر آئے گی۔ تعجب ہے کہ اس سفر میں
کچھ فائدہ نہ ہوا:

یا کرم خود فائدہ در عالم یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد
انگیختہ دہریہ مدح سرائی موقوف کرو۔ اشعار عاشقانہ بطریق غزل کہا کرو اور خوش رہا کرو۔
رشتہ ۲۳ نومبر ۱۸۶۳ ع
صحابت کا طالب، غالب

(۴۹)

بیانی:

تم سچ کہتے ہو کہ بہت سزا دے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں مگر یہ سمجھنا کہ
تمہارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات
کا حال قصص بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے کرائے کی حویلی میں
رہتا ہوں۔ جولائی سے مین شروع ہوا۔ شہر میں پتنگڑوں مکان گرنے اور بینہ کی نئی صورتوں میں
دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی ٹالے بہہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے اٹھنے

بیٹھنے سونے جاگنے بچنے مرنے کا عمل ہے اگرچہ گرا نہیں لیکن چوت چھٹی ہو گئی۔ کہیں لگن کہیں چاہیگی کہیں اکالہ ان رکھ دیا۔ قلمدان کتنا ہیں اٹھا کر تو شے خانے کی کھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی فروغ میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد کیسے چاہیں گے۔

میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمھاری خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب معطلی خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی نہیں رہیں گے۔ بیمار ہیں۔ احسن اللہ خاں معالج ہیں۔ قصہ ہو چکی ہے۔ جو نکلیں لگ چکی ہیں۔ اب مسہل کی فکر ہے۔ سو اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔ نہیں نا تو ان بہت ہو گیا ہوں گو یا صاحب فرماں ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی مسودت کا آ جائے تو اٹھ بیٹھا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے قلم لکھتا ہوں۔ لیٹے لیٹے مسودت دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ!

غالب

صبح جمعہ ۱۳۔ ماہ اکتوبر ۱۸۶۳ ع

(۵۰)

آؤ میرزا تقی میرے گلے لگ جاؤ اور میری حقیقت سنو۔ ایک شبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ ان سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے جو جب حکم رہی گن صاحب کے لکھا تھا۔ پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا۔ دونوں دوچ ان تمھارے اور شہر عشق اور ایک تذکرہ یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی ان کو پہنچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہو گا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اس القات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح لکھیں گے۔ باقی مابقیہ شایع ہوگا۔ ہاں ان کے قصے میں چند وہ ہیں جو پہلے مشاہیر کے علاقے ہیں۔ اگر تمھاری اجازت ہو تو اس امر میں ان سے کلام کروں۔

میرا محبوب حال ہے خیر ان ہوں کہ تمھیں میرا کام کیوں باور نہیں آتا؟

گمان زہست بود بر صفت ز بیدودی
بدست مرگ ولے برتر از گمان تو نیست

سامعہ مر گیا تھا۔ اب ہا صرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی تو تیں انسان میں ہوتی ہیں، سب متصل ہیں۔ جو اس سراسر محفل ہیں۔ حافظہ گویا بھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رکبیں رام پور سورہ یہ مہینہ دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم خواص کا کام ہے اور نہیں اپنے میں خواص نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں، جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات ساہتہ میں شمار کیجئے تو نہیں سکہ لبر کسی اور نہ خیرات خوار کی اور اگر یہ علیحدہ بشرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے، وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے کلام نہیں آتا۔ فوج مقرری نو مہر تک آئی۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب ازراہ جو انفرادی دیے جاتے ہیں اور بھائی تمہاری مشق، چشم بدود و صاف ہو گئی۔ رطب و یابس تمہارے کلام میں نہیں رہا اور اگر خواہی تو اسی تمہارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے، تو میری جان میرے بعد کیا کرو گے؟ نہیں جہان دم صبح و آفتاب سرکود ہوں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

۱۳ جنوری ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ع
نجات کا طالب غالب

(۵۱)

غشی صاحب سعادت و اقبال نشان غشی ہر گویا مال صاحب سطر اللہ تعالیٰ غالب کی
وحائے درویشانہ قبول کریں۔ ہم آپ کو سکندر آباد قانون گویوں کے محلے میں کجے ہوئے ہیں اور
آپ کو کمٹور اہامان سنگھ کی حویلی، منطوقہ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدار یہ حق کو کمٹو کا پی رہے ہیں اور
غشی کو کمٹو صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا غشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یک شنبہ ہے
اخبار کا افاقہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر منٹے کو پنجشنبہ بعد جمعہ کو پہنچتا ہے۔

مرزا آفتاب کیا فرماتے ہو؟ کیسے رہتی گن صاحب، کہاں رہتی گن صاحب! پنجشنبہ کے
دن ۱۹ جنوری سہ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں۔

اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقات تو دلچ کو نہیں کیا۔ انوار الحق گھاٹ پر لوکر ہیں۔ چند روپے مشاہرہ دیتے ہیں۔ زیادہ زیادہ۔

صبح یک شنبہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ ع نہات کا طالب غائب

(۵۲)

میرے مہربان 'میری جان' میرا شکستہ بخند ان !

تھمارا سکندر آباد اور میرے خط کا تھمارے پاس پہنچنا تھماری تحریر سے معلوم ہوا۔ زندہ رہو اور خوش رہو۔ نہیں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگتے نہیں آیا بھیک مانگتے آیا۔ روٹی اپنی گھر سے نہیں کھانا سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور قسم کی ہمت۔ نواب صاحب انور روئے صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق آیت رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تھویدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپے سال بٹنے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہل کار پر ساٹھ ہزار کا محاسب معاف کیا اور بیس ہزار روپے نقد دیا۔ فشی نو لکھنؤ صاحب کی عرض پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی کا سن لیا 'واسطے فشی صاحب کے کچھ عطیہ بتقریب شادی صبیحہ حمید ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔ مصطفیٰ خاں صاحب بتقریب جہنیت مسند فشی و شمول تثنیٰ آنے والے ہیں۔ اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع ۵ دسمبر کو خلعت کا آنا مسوع۔

دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ ع وقت پاشت نہات کا طالب غائب

(۵۳)

لو صاحب !

کچھڑی کھائی دن بھلائے کپڑے پھانے گھر کو آئے

۸ جنوری ماہ و سال حال 'دوشنبہ کے دن غضب الہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تھمارا خط مطامین دردناک سے بھرا ہوا رام پور میں نہیں نے پایا۔ جواب کہنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔

انہوں نے بیمار داری اور غنوار کی بہت کی۔ کیوں ترک لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تھمارے پاس ہے کیا جس کو بیمار پہنکو گے؟ ترک لباس سے قیودِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے چے گزار نہ ہوگا۔ سختی و سختی زنج و آرام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہوا سی صورت سے بہر صورت گزرنے دو۔

تاپ لائے ہی بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اس خط کی رسید کا طالب غالب

(جنوری ۱۸۶۶ء)

(۵۳)

میرزا تقی صاحب:

پہ سوں تمہارا دوسرا خط پہنچا۔ تم سے پردا کیا ہے ایک فتوح کا خطر ہوں۔ اس میں میں نے اپنے ضمیر میں تم کو شریک کر رکھا ہے۔ زمانہ فتوح کے آنے کے قریب آ گیا ہے۔ انشاء اللہ خط میرا مع حصہ فتوح جلد پہنچے گا۔ چند تہ بدری داس ڈاک ٹکٹی کر مال پا آنگہ مجھ سے اس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے۔ مگر میں جب بیٹا تھا تو وہ اپنا کلام اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجتا تھا۔ بعد اپنے مرنے کے نہیں نے اس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام ٹکٹی ہر کو پال تقی کے پاس بھیج دیا کرو۔ اب تم کو بھی لکھتا ہوں کہ تم میرے اس لکھنے کی آن کو اطلاع لکھو۔ نہیں زعمہ ہوں۔ اوپر کے لمبر میں جو اپنے کو مردہ لکھا ہے وہ باقتدار ترک اصلاح انظم لکھا ہے ورنہ زعمہ ہوں مردہ نہیں بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا ناتواں، مفلس، قرضدار کالوں کا بہرہ قسمت کا بے بہرہ و زیست سے بیزار مرگ کا امیدوار۔

غالب

مرزا حاتم علی بیگ مہر

(۵۵)

بہت سنی علم سمجھنا شراب کیا کم ہے؟
غلام ساقی کوڑ ہوں مجھ کو کیا علم ہے؟

غلن میں خلدے غالب کی آتش افشانی

یہیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

علاقہ صحت ازلی کو برحق مان کر اور بیخود غلامی جناب مرتضیٰ علی کو بچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بیٹائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شہنائی بھی تو آخرا یک چیز ہے۔ مانا کہ روشنائی اس کے اچارے میں آئی ہے یہ بھی دلیل آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وادید نہ ہو لے اپنے کو بیگات یک دیگر سمجھیں۔ 'الہتم ہم قوم دوست و مرید ہیں اگر سمجھیں۔ سلام لکھا تھا آپ کی نظر سے گزر گیا ہو۔ اچھا اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا قنات سے لے کر پڑھ لیجیے گا اور خط کے لکھنے کے احسان کو اس خط کے پڑھ لینے سے دو بالا کیجیے گا۔

ہائے بھر جان جا کو ب کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ اس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی دھبہ دلواتا۔ یہ بھی انہیں میں ہے کہ جن کا نہیں مانتی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی نوا نہیں نمرود تو کوئی عزادار نہیں۔

فرز میں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ چشم بدور۔ اردو کی راہ کے تو ساک ہو گیا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی خوبی میں کم نہیں۔ سخن شرط ہے۔ اگر کہے جاؤ گے لطف پاؤ گے۔ میرا تو گویا بقول طالب آملی اب یہ حال ہے:

لب از محقق چنان بستم کہ کوئی دہن بر چہرہ زخمی ہوڈ بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے پیسے مجھے لکھا ہو تو کیونکر مجھے اپنے خط کے جواب کی تنہا نہ ہو؟ پہلے تو اپنا حال لکھیے کہ نہیں نے سنا تھا آپ کہیں کے صدر امین ہیں۔ پھر اکبر آباد میں کیوں خاندانین ہیں؟ اس پہلو میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی؟ راجہ بلوان سنگھ کا بھی حال لکھنا ضرور ہے۔ کہاں ہیں اور وہ ہزار روپے مہینہ جو ان کو سرکار انگریزی سے ملتا تھا اب بھی ملتا ہے یا نہیں؟

ہائے لکھو! کچھ نہیں کہتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری۔ اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے؟ خاندان شجاع اللہ دہلوی کے ذن و مر کا انجام کیا ہوا؟ قبلہ و کعبہ محمد انصاری سرگزشت کیا

ہے؟ ممکن کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگاہی ہوگی۔ امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ پتہ ممکن مہارک کا شیرازی بازار سے زیادہ نہیں معلوم۔ ظاہراً اسی قدر کافی ہوگا، ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔

میرزا آقہ کو دوما کہیے گا اور ان کے اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دیجیے گا جس میں آپ کے خط کی انہوں نے نوید لکھی تھی۔ والسلام
غالب

(۵۶)

خود شکوہ دلیل رفع آرزو بس است
آیہ بزاں ہر آنچه از دل برود

بندہ پرور!

فقیر شکوہ سے نہ انہیں ملتا، مگر شکوہ کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی غرض یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور معیذ اور سرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔ کیا نہیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا، اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھا؟ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس عرصہ میں کئی خط بھجوائے اور وہ اٹلے پھرتے؟ آپ شکوہ کا ہے کہ کرتے ہیں اپنا گناہ میرے ذمہ دھرتے ہیں۔ نہ جانتے وقت لکھا کہ میں کہاں جاتا ہوں نہ وہاں جا کر لکھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ کل آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آج نہیں نے اس کا جواب بھجوا لیا۔ کیسے اپنے دعوے میں صادق ہوں یا نہیں؟ پس درویشوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں۔ مرزا آقہ سے آپ فقط ان کے خط نہ لکھنے کے سبب سرگراں ہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ان دنوں کہاں ہیں۔ آج تو کلاٹ علی آقہ سکندرا بادشاہ بھیجتا ہوں۔ دیکھوں کیا دیکھتا ہوں۔

(۵۔ مارچ ۱۸۵۸ ع)

غالب

(۵۷)

بھائی صاحب،

از روئے تحریر مرزا آقہ آپ کا چھ کتابوں کی تزئین کی طرف متوجہ ہونا معلوم ہوا۔ پھر

بہائی غشی نمی بخش صاحب نے دوبار لکھا کہ میں باہر مال لکھتا ہوں مفصل مرزا حاتم علی صاحب نے لکھا ہوگا۔ یارب ان کے دو خط آئیں مرزا صاحب نے اگر لکھا ہوتا تو ان کا خط کیوں نہ آتا؟ اپنے حسن اعتقاد سے یوں سمجھا کہ نہ لکھتا نہ لکھا۔ یکہ دلی ہے۔ جب اپنا کام سمجھ لیے تو مجھ کو لکھنا کیا ضرور ہے؟ مگر اس کو کیا کروں کہ جواب باتوں کا جواب نہیں۔

مطلع اخبار "آفتاب عالمیاب" میں یکم ستمبر ۱۸۵۸ء حال سے حکیم احسن اللہ خاں کا نام لکھوا دینا اور نمبروں کا اخبار ایک بار بھجوا دینا اور آئندہ ہر وقت اس کے ارسال کا طور ظہر اویا۔ کیوں صاحب؟ یہ امر ایسا کیا دشوار تھا کہ آپ نے نہ کیا؟ اور اگر دشوار تھا تو اس کی اطلاع دینی کیا دشوار تھی؟ ابھی شکایت نہیں کرتا پچھتا ہوں کہ آیا یہ امور مقتضی حکایت ہیں یا نہیں۔ مرزا تقی کے ایک خط میں یہ قصہ لکھ چکا ہوں۔ کیا انھوں نے بھی وہ خط تم کو نہیں پڑھایا؟ ہر چند عقل دوڑائی، کوئی درجہ کی وجہ خیال میں نہ آئی۔ اب حصول مدعا سے قطع نظر، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دیکھوں چہ مینے بعد، برس دن بعد، اگر مرزا صاحب خط لکھتے ہیں تو اس امر خاص کا کیا جواب لکھتے ہیں۔ میں بھی شاعر ہوں۔ اگر کوئی مضمون ہوتا تو میرے خیال میں آ جاتا۔ کوئی عذر ایسا میرے ذہن میں نہیں آتا کہ قابلِ ماعت کے ہو۔ میں بھی تو دیکھوں تم کیا لکھتے ہو؟

عالمیاب

۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۸)

بہائی صاحب،

تینتیس ستمبر ۱۸۵۸ء کو برادر غشی شیو نرائن کی، کل جمعہ کے دن ۱۲ نومبر کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا کہ ظالمی کام پر یہ کتابیں طلاس بھشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست، مگر دیکھیے مجھ کو ان کا دیکھنا کب تک میسر ہو؟ آپ پر گمان تھام لیا کا گزرے، یہ تو کیونکر ہو؟ ہارسا صاف جلد کے بنانے کی نسبت سے حق کا ہلا دینا چاہئے، یعنی مدت مناسب سے زیادہ دیر نہ لگے۔

اور ہاں حضرت، کچھ ایسی چٹنگی اور سال کے وقت کر لیجئے گا کہ وہ پارسل آشوب تلف

سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے۔ مجھ کو وہ ایک ایک جلد اپنی جان سے زیادہ

عزیز ہے۔ یا الہی! یہ خط راہ میں ہو اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ و امان میں محفوظ پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جواب لکھیے۔ اس میں مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانہ کیا ہے۔

یا رب ایسے آرزوئے من چہ خوش است
تو ہمیں آرزو مرا برسیں
(غالب)

مرسلہ شنبہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ ع

(۵۹)

بھائی جان :

کل جو چند روز مبارک و سعید تھا گویا میرے حق میں روزِ عید تھا۔ چار گزری دن رہے نامہ فرحت فرجام اور چار گزری کے بعد وقتِ شام :

سات جلدوں کا پارسل پہنچا واہ کیا خوب! برکل پہنچا
آ دی کو موافق اس کی جہاں کے آرزو برآئی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ
برقرار و ہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ نہیں صرف اس قدر خیال کرتا
تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی نو کی نو میں لڑیں اور پانچ کی نو میں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ! اگر تصور
میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ جب تک جہان ہے تم جہان میں رہو۔ آخر اظہار
ظہیم اسلام کی امان میں رہو۔ میرا مقصد یہ تھا کہ ایک کتاب مثل ان چار کے بن جائے نہ یہ کہ وہ
کتابوں کا سار تک دکھلائے۔ اب نہیں حیران ہوں کہ آیا شمار احمد نے ان بارہ روپوں میں برکت
دی یا کچھ تھا مارو پیہ صرف ہوا۔ دو پارسلوں کا محصول دورِ جیلوں کا معمول تین کتابوں کی نو میں
طلائی! یہ ساری بات اس روپے میں کیونکر بن آئی؟ اور کیونکر معلوم کروں؟ کس سے پوچھوں؟ خدا
کے تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو۔ تحقیقاتی آ دی کو بغیر حال معلوم
ہوئے یا کئے آرام نہیں آتا۔ جہاں محبتیں دینی اور روحانی ہوں وہاں تکلف نہیں آتا۔ زیادہ اس
سے کہ شکر گزار ہوں اور شرمسار ہوں کیا لکھوں؟

چارہ خاموشی است چیزے را کہ از خمیں گزشت

(۶۰)

خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پااتا ہوں۔ میرزا تقی کا خط جو آپ نے نقل کر کے بھیج دیا ہے، ہمیں نے فشی شیونرائٹ کو بھیجا ہو، اصل خط دیکھ لیا ہے۔ اگر تم مناسب جانو تو ایک ہات میری مانو۔ "رقعات عالمگیری" یا "انشاء غلیظہ" اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو مہارت اس میں سے پسند آیا کرے، اپنے خط میں لکھ دیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمہارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔ اگر کبھی کوئی قصیدہ کہا، اس کا دیکھنا مشاہدۂ اخبار پر موقوف رہا:

برسات عاشقان بر شام آہ

واقعی جو اخبار آگرہ سے دئی آتے ہیں، وہ میرے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحب ہوش میں آؤ اور مجھ کو بتاؤ کہ یہاں جو پارسیوں کی دکانوں میں "فرنجی" اور "شام چین" کے درجن دھرے ہوئے ہیں یا ساہوکاروں اور جوہریوں کے گھر روپے اور جواہر سے بھرے ہوئے ہیں نہیں کہاں وہ شراب پینے جاؤں گا اور وہ مال کیوں کراٹھاؤں گا؟ بس اب زیادہ باتیں نہ بنائیے اور وہ قصیدہ مجھ کو بھیجوائیے۔ ہمیں نے کتابیں چاہا، بیبل پارسل ارسال کی ہیں، اگرچہ کچھ کی خبر پائی ہے مگر نوید قبول ابھی تک نہیں آئی ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان

ہو رہے گا ہم کو نہ کچھ تمہرائیں کیا

دیکھنا ہماری اس غزل کا مطلع کیا ہے:

خار سے باز آئے یہ باز آئیں کیا؟

کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا؟

موج غل سر سے گزر ہی کیوں نہ جاے

آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں گا؟
 جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا؟
 پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
 کوئی غلام کہ ہم غلامیں کیا؟

غزل نامہ ہے:

ہے ہر اک ان کے اشادوں میں نکلاں اور
 کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے سماں اور
 تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اُٹھیں گے
 لئے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
 لوگوں کو ہے خود شید جہاں تاب کا دھوکا
 ہر روز دکھاتا ہوں نہیں اک داغِ نہاں اور
 امد سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو چھو
 ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کہاں اور
 یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
 دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
 ہر چند سبک دست ہوئے بتِ شقی میں
 ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور
 پاتے نہیں جب راہ تو چھ چلتے ہیں نالے
 رکھی ہے بھری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
 مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
 جلاؤ کو لیکن وہ تجھے چائیں کہ ہاں اور
 ہیں اور بھی دنیا میں سخنود بہت اچھے
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ جیاں اور

روشنی کا دن ۲۰ دسمبر کی صبح کا وقت ہے۔ آگنی شکی رکھی ہوئی ہے۔ آگ تپ رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہاں شاعر یاد آئے مجھے تم کو لکھ بیجے۔ والسلام

(غالب)

(۲۰ دسمبر ۱۸۵۸ء)

(۶۱)

شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب

اے تو غائب و نظر مہر تو ایمان من است

علیہ مبارک نظر افروز ہوا۔ جانتے ہو کہ میرزا یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا اس کا اعتقاد کیا ہے؟ کبھی نہیں نے بزم احباب میں کہا ہو گا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو ہی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرح دار آدمی ہیں اور بھائی تمہاری طرح داری کا ذکر نہیں نے ”مغل جان“ سے سنا تھا جس زمانے میں کہ وہ خواب حاتم علی خاں کے نوکر تھے اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ بدلتا تھا تو اکثر ”مغل“ سے پہروں اعتقاد ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمہارے شعرا اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے ہیں۔

بہر حال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا تو بھی درازی میں آگشت نہا ہے۔ تمہارے گندی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمکانی تھا اور دیدہ و دلورنگ اس کی مستانگی کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا بچر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ دازمی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آئے۔ کیا کہوں گی پر کیا گزری۔ بھول شیخ علی عزیزی:

تا دسرم بود ز دم چاک گرہاں

شرمندگی از غرور پیشینہ عیارم

جب دازمی مونچھ میں ہال سفید آگئے تیسرے دن چوٹی کے اٹے کے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کما گئے کے دردانت ٹوٹ گئے، ناچار منی بھی چھوڑ دی اور دازمی بھی۔ مگر یہ یاد

رکھے کہ اس بھوٹے شہر میں ایک دروی ہے عام۔ ملا باطنی، مجھ بندہ دھوبی، سقا، بھٹیاری، جولاہا،
کھڑوت پر داڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سرمند دایا۔ لا حصول ولا
قوة الا بالله العلی العظیم۔ کیا کب رہا ہوں۔

صاحب بندہ نے ”دختیہ“ جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایلمنٹن صاحب بہادر
لقنت گورنر بہادر غرب دشمال کی تذکرہ نگینی تھی۔ سوان کا فارسی خط محررہ دہم مارچ مشعل برتھمن
آفرین داکٹر غوثنودی بطریق ڈاک آگیا۔ پھر نہیں نے تہنیت میں لقنت گورنری کے قصیدہ
فارسی بھیجا۔ اس کی رسید میں انعم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر مختصم خط فارسی بہیل ڈاک مرقومہ
چار دہم آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح تہنیت میں جناب رایت شکری صاحب بہادر لقنت
گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں بواسطہ صاحب کشتہ بہادر دہلی بھیجا تھا۔ کل ان کا مہری خط
پذیر یہ صاحب کشتہ بہادر دہلی آگیا۔ پاشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم
ہوتے جاتے ہیں۔ دیر آید دست آید۔ اناج کھانا ہی نہیں ہوں۔ آدھ میر گوشت دن کو اور پانچ بھر
شراب رات کو لے جاتی ہے۔

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو مسکيا ہے؟
حصیں کہہ کہ یہ انداز صفتگو کیا ہے؟

اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس فزل کے طالب کا ذوق پکا ہے تو یہ فزل اس خط سے
پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ رہا سلام و ادب پہنچا دیں گے۔
(مارچ یا اپریل ۱۸۵۹ء)

(۶۲)

جناب مرزا صاحب

دلی کا حال تو یہ ہے:

کمر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ قہیر س ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ وہ بڑھنٹا ہے۔ اگر کچھ ہے تو بدیں بٹ ہے کہ
چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا۔ اہل قلم اور اہل فوج نے باہنفاق ہندو گراں بند بست کیا کہ
وہ قیامت گیا۔ اب امن و امان ہے۔ ناخ مرحوم جو تمہارے استاد تھے میرے بھی دوست
صادق الوداد تھے۔ مگر یک فتنے تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدے اور مثنوی سے ان کو کچھ
علاقہ نہ تھا۔ سبحان اللہ تم نے قصیدے میں وہ رنگ دکھایا کہ انشاء کو رشک آیا۔ مثنوی کے اشعار
جو نہیں نے دیکھے کیا کہوں کیا خطا تھا:

دُعا سے نہیں بھی چاہوں از رو میر
فروغ ”میرزا حاتم علی میر“

اگر اسی انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کا رنٹہ اردو کہلائے گی۔ خدام کو بھڑا رکھے۔
تمہارا دم نصیحت ہے۔ صاحب نہیں تم سے پوچھتا ہوں کہ ”معیار اشعار“ میں تم نے اپنا خط کیوں
چھپوایا؟ تمہارے ہاتھ کیا آیا؟ سنو تو سنی اگر سب کا کام اچھا ہو تو امتیاز کیا ہے۔

(غالب)

(۶۳)

میرزا صاحب

آپ کا غم فرائیڈ پہنچا۔ نہیں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے
جو میرے سامنے اس مرحوم کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا، یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے
محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب، شعر میں فردوسی اور فقرامیں حسن بھری اور
عشاق میں بھٹوں، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پٹیتا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو
جائے فقیر کی احتیاج یہ ہے کہ حسن بھری سے کھر کھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ بھٹوں کی ہم طرحی
نصیب ہو۔ لیکن اس کے سامنے مری تھی تمہاری مجھ پر تمہارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر
ہوئے کہ لیکن اپنے گھر میں اور تمہاری مثنوی تمہارے گھر میں مری۔ بھئی ”مغل بچے“ بھی غضب
ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار دیتے ہیں۔ نہیں بھی ”مغل بچے“ نہیں۔ مگر میں ایک بڑی
ستم پیشہ ذہنی کو نہیں نے بھی مار دیا ہے۔ خدا ان دونوں کو بٹٹے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ نہ مگر

دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس یا پچاس برس کا یہ واقعہ ہے۔ ہا آ نکہ یہ کوچہ
 چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانہ تھن ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا
 مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ چاہتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنکڑے عشق
 بھاری چھوڑ دو:

سعدی اگر عاشقِ سخی و جوانی عشقِ محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ
 اللہ بس ناموایِ ہوس

(۶۳)

مرزا صاحب:

ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ بیستھو برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔
 ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع
 فقر و فاقہ نہیں۔ بچہ کھاؤ، خرے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی کبھی خواہش نہ ہو۔ سو میرا
 اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مریے۔ کسی الگ الفاظی کہاں
 کی مرثیہ خوانی۔ آ زادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ، اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو "پنا
 جان" نہ کہی "نشنا جان" سخی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو
 گئی اور ایک قعر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگی
 ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے۔ وہ حورِ اجربان ہو جائے گی۔
 طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زعفریں کا رخ اور وہی طوبی کی ایک شاخ؟ چشم بدور وہی ایک
 حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ:

زینِ تو کُن اے دوست در ہر بہار کہ تقویم پارینہ ناید ہار

میرزا مظہر کے اشعار کی تصنیف کا مسدس دیکھا، فکر سراپا پسند، ذکرِ جہم، جہتِ ناپسند،
 اپنے نام کا قلم مع ان اشعار کے مرزا یوسف علی خاں مزین کے حوالے کیا۔

نکری نواب محمد علی خاں صاحب کی خدمت میں سلام۔ پورہ گارہاں کو سلامت رکھے۔
 مولوی عبدالوہاب صاحب کو میرا سلام۔ دم دے کر مجھ سے فارسی مہارت میں خط

کھسوا یا نہیں خطر رہا کہ آپ کھٹو جائیں گے وہ عمارت جناب قبلہ و کعبہ کو دکھائیں گے۔ ان کے مزاج اقدس کی خیر و عافیت مجھ کو رقم فرمائیں گے۔ کیا جانوں کہ حضرت میرے وطن میں جلوہ افروز ہیں:

یار در خانہ دامن گرد جہاں سے مردم
اب مجھے ان سے یہ استدعا ہے کہ خطِ خاص سے مجھ کو خط لکھیں اور کھٹو نہ جانے کا
سبب اور جناب قبلہ و کعبہ کا حال جو کچھ معلوم ہو وہ سب اس خط میں درج کریں:
(۱۸۶۰ ع) غالب

منشی شیونرائن آرام

(۶۵)

برخوردار اقبال نشان منشی شیونرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو۔ تمہارے دو خط متواتر پہنچے۔ میرے بھی دو خط ہیں و بیش پہنچے ہوں گے۔ موافق اس تحریر کے عمل کیا ہو گا۔ دو جلدیں بڑے تکلف اور پانچ جلدیں بہ نسبت اس کے کم تکلف مرزا عاقم علی صاحب کے عہدہ اہتمام میں ہیں۔ اس سے ہم کو اور تم کو کچھ کام نہیں ہو، جیسی چاہیں خوا کر بھیج دیں۔ تم ایک جلد، بس۔ زیادہ صرف کیوں کرو؟ اپنے طور پر اپنی طرف سے بھی چاہو، خوا کر بھیج دو۔ نہیں تم کو اپنے پیارے ناصر منشی دھری نشاننی جانتا ہوں۔ اس کو تمہاری نشاننی جان کر اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ باقی حال اپنے خاندان اور تمہارے خاندان کا اور باہم بیکر اپنا اور منشی دھر کا بڑے ہوتا سب تم کو لکھ چکا ہوں، متکرر کیا لکھوں؟

بادشاہ کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اچھا ہوا شہر، نہ آدی نہ آدم زاد، مگر ہاں دو ایک مصو روں کو آہادی کا حکم ہو گیا ہے۔ دور ہے ہیں، سو وہ بھی بعد اپنے گمروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں۔ تصویر میں بھی ان کے گمروں سے لٹ گئیں۔ جو کچھ ہیں وہ صاحبان انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔ ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے، وہ تمہیں روپے سے کم نہیں دیتا۔ کہتا

ہے کہ تین تین اشرفیوں کو نہیں لے صاحب لوگوں کے ہاتھ پہنچی ہیں تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔
 ہاتھ دانت کی جفتی پر وہ تصویر ہے۔ نہیں لے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے اس کے بھی تین
 روپے مانگتا ہے۔ پھر خداجانے اچھی ہو یا نہ ہو۔ اتنا صرف بچا کیا ضرور ہے؟ نہیں لے دو ایک
 آدمیوں سے کہہ رکھا ہے، اگر کہیں سے ہاتھ آ جائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مصوروں سے
 خرید کرنے کا تھوڑا مقدور نہ تھا رانقصان منظور۔

اب چھاپا تمام ہو گیا ہو گا۔ وہ پانچ اور دو سات کتابیں جو میرزا صاحب کی تحویل میں
 ہیں وہ اور وہ ایک جلد جو تم نے مجھ کو دی کی ہے وہ سب لوح اور جلد کی دوستی کے بعد پہنچ جائیں گی
 مگر وہ چالیس سرسری جو مجھے چاہیے ہیں تو آج کل میں روانہ کرو اور ہاں میری جاں یہ چالیس
 کتابوں کا پتہ نہ کیونکر پہنچے اور حصول اس کا کیا ہو گا؟ اور یہ بھی تو بتاؤ کہ وہ دس جلدیں رائے امید
 سنگھ کے پاس کہاں بھیجی جائیں گی؟ میرزا آقہ پاترس کو جاتے ہوئے ان کا اندور (میں) نہ ہونا اور
 پھر شاید آگرہ اور دہلی کا آنا مجھ کو لکھ بچے ہیں۔ ان باتوں کا جواب مجھ کو لکھو۔ تصویر کے باب میں جو
 کچھ لکھو وہ کروں اور ان مقدمات سے اطلاع پاؤں۔ جواب جلد لکھو اور مسلسل لکھو۔

لکھنؤ ورواں داختر، شبہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۸ ع
 غالب

(۶۶)

برخوردار ششی شیخو نرائن کو دعا کے بعد معلوم ہو مقصود پہنچی تحریر پہنچی۔ سنو میری عمر ستر برس
 کی ہے اور تمہارا دادا امیرا ہم عمر اور باہم باز تھا اور نہیں لے اپنے نانا صاحب خواجہ غلام حسین مرحوم
 سے سنا کہ تمہارے پردادا صاحب کو اپنا دوست بتاتے تھے اور فرماتے تھے کہ نہیں جی دھر کو اپنا
 فرزند سمجھتا ہوں۔ فرض اس بیان سے یہ ہے کہ سوسو سو برس کی ہماری تمہاری ملاقات ہے۔ پھر
 آپس میں نامہ پیام کی راہ درسم نہیں اور اس راہ درسم کے مسدود ہونے کا حاصل یہ ہے کہ ایک کو
 دوسرے کے حال کی خبر نہیں۔ اگر تم کو میرے حال سے آگاہی ہوتی تو مجھ کو بسبیل ذاک کبھی
 اکبر آ پادشاہ جاتے۔

لواں میری حقیقت سنو۔ چٹا مینڈ ہے کہ سید سے ہاتھ میں ایک بھنسی نے پھوڑے

کی صورت پیدا کی۔ پھوڑا چمک کر، بھوٹ کر، ایک زخم، زخم کیا ایک غار بن گیا۔ بعد وستانی جراحوں کا علاج رہا۔ بگڑتا گیا۔ دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلا نیس ووڈ رہی ہیں۔ استرے سے گوشت کٹ رہا ہے۔ میں دن سے صورت افاقہ کی نظر آنے لگی ہے۔

اب ایک اور داستان سنو۔ غدر کے رعب ہونے اور دلی کے رعب ہونے بعد میرا نفس کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آنکھ کو بدستور بے کم و کاست چاری ہوا۔ اگر لاث صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی اور مقررہ تھا سدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیر حکیم، مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا۔ بڑے لاث صاحب کے درود کے زمانے میں نواب لغٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آئے دربار کیا۔ خیر کرو، مجھ کو کیا؟ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چراسی آیا اور کہا نواب لغٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی! یہ آخر فروری ہے اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس دائیں ہاتھ کے زخم کے 'سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا اُجھا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں۔ اُٹھنا دشوار ہے۔ بہر حال سوار ہوا گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قصود میں کیا، بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی۔ یعنی عنایت سی عنایت 'اخلاق سے اخلاق' وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ تم تھے کو اپنی طرف سے ازراہ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کلا رہڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا لہر اور خلعت کھل گیا۔ اُٹالے جا' دربار میں شریک ہو' خلعت پہن۔ حال عرض کیا گیا۔ فرمایا۔ خیر، اور کبھی کے دربار میں شریک ہوگا۔ اس پھوڑے کا نہ ابو۔ اُٹالے نہ جاسکا۔ آگرے کیوں کر جاؤں؟ ہابوہر کو بند سہائے کو سلام۔

میر مہدی حسین مجروح

(۶۷)

میاں!

تم کو بخش کی کیا جلدی ہے؟ ہر بار بخش کو کیوں پوچھتے ہو؟ بخش جاری ہو تو نہیں تم کو
اخلاص نہ دوں؟ ابھی تک کچھ حکم نہیں۔ دیکھو! کیا حکم ہو اور کب ہو؟ میرا صاحب ہے پور پہنچے،
تم شاہ پور ہی بتاتے ہو۔ شاید سچ بھی ہو۔ ہاں میرے محمود علی اور یہ میرے برادر ابو الغضل تو تجھے مکر دیکھا
چاہیے درشت جگہ سے اکڑ کر بدشواری جتا ہے۔ غلام میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار
کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں۔ سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے۔ سنی الگ، شیعہ الگ، نیک
جدا، بد جدا۔ میرے سرفراز حسین کو دو عالمہ نصیر الدین کو پہلے بندگی، پھر دغا۔ کتاب کا نام ”دخنیو“ رکھا گیا
آگرے میں چھاپی جاتی ہے۔ تم سے تمہارے ہاتھ کے اوراق لکھے لوں گا۔ جب ایک کتاب تم کو
دوں گا۔

از غالب

روز بروز دہشتہ ستمبر ۱۸۵۸ ع

(۶۸)

سید صاحب!

تمہارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔ لیکن زمانہ
وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا تو کیا معلوم ہوا کہ ڈھائی سو دیے۔
ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں۔ ڈھائی سو کیسے ہیں؟ سبحان اللہ۔ ہاں جو اس تہی دستی
کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے مجھے بلا سے آبرو دیں۔ اب میرے سرفراز حسین کو چاہیے کہ انور چلے
جائیں۔ شاید بے بندوبست میں کوئی صورت نوکری کی نکل آئے۔ میری دعا کہو اور یہ کہو کہ اپنا
حال اور اپنا قصہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو لکھیں۔ بخش کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو کہوں۔ حاکم خط کا
جواب نہیں لکھتا۔ محلے میں ہر چند شخص کہنے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ یہ ہر
حال اتکا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ نہیں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر

بہادر کی رائے میں ملین پانے کا اشتقاق رکھتا ہوں۔ پس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم نہ کسی کو خبر۔
 میاں کیا باتیں کرتے ہو؟ نہیں کہ میں کہاں سے چھوڑا؟ رولی کسے کو نہیں۔
 شراب پینے کو نہیں۔ چاڑے آتے ہیں 'لٹاف تو شک کی لگہ ہے' کہ میں کیا چھوڑا؟ فشی امید
 سنگھ اندر والے ولی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا
 ۔ انہوں نے وہ سزا دیکھا۔ چھوڑنے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید فشی ہر گوپال تفت تھا۔
 اس کو نہیں لے کھا۔ اس نے اس احتیاج کو اپنے ذمہ لیا۔ سو وہ بھیجا گیا۔ آٹھ آدنی جلد قیمت
 ضمیری۔ پچاس جلدیں فشی امید سنگھ نے لے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی
 بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بشمول سنی فشی ہر گوپال تفت چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو
 دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس
 جلد میں شاید پچیس جلد فشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ نہیں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ برسوں خطا تفت کا
 آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ ایک فرسہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔
 برائی نہیں نے اسی ۱۸۵۷ء سے اکیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور دوا خاترمیں
 اس کی اطلاع دیدی ہے۔ امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی رداگی کا حال کیونکر
 لکھتا؟ ان کو جاگیر اگست میں ملی، بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ فشی امید
 سنگھ اندر جانے والے تھے۔ اگر ختم کر کے سو وہ ان کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھوڑا کون
 ؟ اہل خطہ کا حال از روئے تفصیل مجھ کو کیونکر معلوم ہو؟ سنتا ہوں کہ دعویٰ خون پیش کیا جاتے
 ہیں۔ سودا ہو گیا۔ سودہ ہو رہا ہے۔ جنگ صاحب کے بے پور میں ٹکڑے اڑ گئے۔ گورنر دی نہ
 ہوئے قصاص نہ لیا۔ اب ایک ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟

اے سہزادہ سر وہ از جور پا چہ خالی

دور کیش روزگار اس گل خوں بہا نہ داد

خیر جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ بعد وقوع ہم بھی سن لیں گے۔ تم اتنا کیوں دل جلا رہے ہو؟

(غالب)

(اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۸ء)

(۶۹)

واہ واسید صاحب، تم بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمایاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں۔ مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو یہ سبب اب کے و سرودی نہیں تو نہیں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے، مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں۔ بھائی تم اردو کے مرزا قلیں بن گئے ہو۔ اردو بازار میں میر کے کناہے رہتے رہتے روڈنٹل بن گئے ہو۔ کیا قلیں، کیا روڈنٹل۔ یہ سب غبی کی باتیں ہیں۔ لوسنوکب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔

چوک! میں جیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ خشک و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ نئی داروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھاکر راستہ چھڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام، بہک نہیں سہنسں داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ، بے پوری کی زہد، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی ہے۔ بادشاہ، میرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ، زہد محل، خلکتہ پٹنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی۔ دیکھئے کیپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس، جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات آزادی، سوسارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کئے جائیں گے اور بنسں داروں کی جھولیاں بھر بھر کر دے دئے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے۔ اب کے شہنہ کو بڑا دن اور اگلے شہنہ کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس کا جواب لکھو اور مشاب لکھو۔

میری جان سرفراز حسین تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو اور آئندہ عزیمت کیا ہے؟ میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاق دینا اور۔ میرن صاحب کہاں ہے؟ کوئی جائے اور بلا لائے۔ حضرت آئیے۔ سلام علیکم مزاج مبارک، کیسے مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا تو کیا لکھا؟ نہیں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز علی کم اور یہ ستم چہرہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں؟ نہیں کہیں تم کہیں۔

وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیوں کر تم سے بے ادبیاں کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب ایک جاہلوں کے انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے کیوں کر ایک جاہلوں کے۔ دیکھئے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے۔ اللہ اکبر! اللہ!

بدھ ۳۷۔ دسمبر ۱۸۵۸ ع

غالب

(۷۰)

سید صاحب

ندم مجرم نہیں گنہگار۔ تم مجبور نہیں ناچار۔ لو اب کہانی سنو میری سرگزشت میری زبانی سنو اب مصطفیٰ خاں پہ بیجا دسات برس کے قید ہو گئے تھے سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہاں گھبراہٹ کی ذمہ داری اور دلی کی اٹھاک اور غصے کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی ہیں۔ ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ نہیں پہنچ رہا اجتماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا، چاروں وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں مگر ہفتہ کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو نہیں جواب لکھتا ہوں:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے

کچھ کچھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی حدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسپائی پر قیامت نہیں ہے۔ لاہوری اور دواڑے کا تھانے دار ماسٹر صاحب چھاکر سڑک پر بیٹھا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بھا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالہ دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے چانچا چانچا بید گتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریاقت کرو کون بے گتہ مقیم ہے اور کون گتہ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشہ مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جھدار مصرے پاس بھی آیا۔ نہیں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں نہ دکھ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں غنہ دار ۱۸۵۰ ع سے حکیم پٹیلے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکلا

میا۔ کرنل برون صاحب بہادر اس کے ذیانی حکم پر اس کی اقامت کا عہدہ ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عہدہ جمعہ دار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوٹوالی بھیج دی۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان وکان کیوں جاتے ہیں؟ جو مکان میں چکے ہیں انہیں ڈھادو اور آجندہ کی ممانعت کا حکم سناؤ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار گنت چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے اہل قدر مقدور نڈراندہ ہے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ وہ یہ دے اور گنت لے۔ مگر یہ یاد ہو جائے آپ شہر میں آیا ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے نہ دیکھئے شہر کے بسنے کی کون سی صورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں یا باہر چلے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک لہو الملک لہو۔

نور چشم میر سرفراز حسین اور رفیع وار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے جو وہ چاہیں قبول کریں۔

بدھ ۲ فروری ۱۸۵۹ء

عالم

(۷۱)

میری جان!

خدا تم کو ایک سو میں برس کی عمر دے۔ بوڑھا ہونے کو آیا۔ دازمی میں ہال سفید آگئے۔ مگر بات سمجھنی نہ آئی تھیں کے باب میں اُلجھے ہو اور کیا بے جا اُلجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ ولی کے سب غنم داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے غنم نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء ہائیکسواں مہینہ ہے۔ چند اٹھاس کو بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مد و خرج مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آجندہ ماہ بڑا ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ تم اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اس واقعہ سے اس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں؟ یہ حضرت کا سوال میر خسرو کی اہلی ہے:

جیل ہوا لے گئی تو کاچے سے بچکوں راپ؟

علی بخش خاں چچاس روپے مہینہ پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گیا باقی روپیہ چار ہزار آیا۔ آجندہ ملنے میں کچھ کام نہیں۔ غلام حسن خان سو

روپیہ مینے کا پٹن وار۔ بائیس مینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو روپے ملے۔
 دیوان کشن لال کا لڑکا دو سو روپے مینے بائیس مینے کے تین چار تین سو ہوتے ہیں اس کو اٹھارہ سو
 روپے ملے۔ مناجندار دس روپیہ مینے کا سکہ لبر۔ سال بھر کے ایک سو تین لے آیا۔ اسی طرح
 چندہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آچندہ کے واسطے کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط پر
 خط لکھتے تو آخر خط پر صاحب کشتہ بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔
 نہیں نے وہ سو روپے نہ لئے اور پھر صاحب کشتہ بہادر کو لکھا کہ میں باخندہ روپے آٹھ آنے مینے
 پانے والا ہوں۔ سال بھر کے سزا دے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پٹن داروں کو سال
 سال بھر کا روپیہ ملا مجھ کو سو روپے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل
 جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔

آبادی کا یہ رنگ ہے کہ اخطہ دراپنا کر نکلت چھپا کر اجڑن صاحب بہادر بطریق
 ذاک نکلت چلے گئے۔ دلی کے حقا جو باہر چلے ہوئے ہیں منہ کھول کر رہ گئے۔ اب وہ جب
 معاہدہ کریں گے تب شاید آبادی ہوگی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔
 میر فر از حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعا نہیں پہنچیں۔

غالب

فروری ۱۸۵۹ء

(۷۲)

سید

خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا اہنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا
 ہے۔ ایک غریب سید مظلوم کے چہرہ نورانی پر مہاسا نکلا ہے تم کو سربا پے آرائش گفتار مجھ پہنچا ہے۔
 میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عاقبت جلد لکھو۔

بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ
 اگست ہی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس
 مینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مینے کے باقی ہیں۔ آج
 ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور مصابت کی ہے اور اس غزوہ کی میں ایک گونہ خوشی اور کبھی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہو گا کہ ایک ”دستہ“ نواب قسٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب قسٹ گورنر بہادر کا خط مقام الرآباد سے بسیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افغانی ’وی القاب قدیم‘ کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ غنیمت کے لئے کا حکم بھی آج کل آیا جا رہا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے پاس سے بھی کتاب کی تحسین اور مصابت کے مضامین کی تحریر آ جائے۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سر فراد حسین اور میر نصیر الدین کو دعا کہہ دینا اور خط دکھا دینا۔

(غالب)

۱۸۵۹ء

(۷۳)

بارڈر الایا، سیری جواب طلبی نے اس چرخ کج رفتار کاڑھ اہو۔ ہم نے اس کا کیا پکاڑا تھا؟ ملک و مال و جا و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ پوش تھا۔ چند مطلقہ سپنو ایک جگہ فراہم ہو کر ٹس پول لیتے تھے۔

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے ملک

اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یاد رہے۔ یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

”کل سے مجھ کو خواجہ میکش بہت یاد آتا ہے۔“ سو صاحب! اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ مجھتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی ”مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی“ یہ تقریر سلائی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ یہ ہر حال کچھ لکھتا ہوں۔ دیکھو کیا لکھتا ہوں۔

سنو نہیں کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال معلوم نہیں۔ ویرا پردہ دست آئی۔

بھئی نہیں تم سے بہت آرزو ہوں۔ میرن صاحب کی جھور سنی کے بیان میں نہ اعتماد سر نہ مجھ کو تنہیت۔ بلکہ اس طرح سے لکھا گیا ہے گویا ان کا سحر دست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔

لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے۔ اُچھلنے کو دتے بھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے، کیا غضب ہوا یہ کیوں اٹھے ہو گئے۔ یہ ہاتھیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سُنا ہو گا۔ یہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں:

کیوں نہ نیرن کو مقتلم جانوں؟ دلی والوں میں اک بچا ہے یہ
میر تقی کا مقطع یہ ہے:

میر کو کیوں نہ مقتلم جانوں؟ اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ
”میر“ کی جگہ ”میرن“ اور ”رہا“ کی جگہ ”بچا“ کیا اچھا تصرف ہے!

اوسے میاں ’تم نے کچھ اور بھی سنا؟ کل یوسف مرزا کا خط لکھتے سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں عرف نواب جان، والدان کا دائم الحسوس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیسی آفت آئی۔ یوسف مرزا تو جھوٹ کا ہے کوئی کھسکا۔ خدا کرے اس نے جھوٹ سنا ہو۔

لو سنی اب تم چاہو بیٹھے رہو چاہے جاؤ اپنے گھر نہیں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر پاہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک نہیں اور ایک میرا بیٹا حسین علی خاں۔ یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے ”کھٹلو نے منگا دو نہیں بھار (پازار) جاؤں گا۔“

میر سرفراز حسین کو کوغا کہنا اور یہ خط ان کو ضرور سنا دینا۔ برخوردار میر نصیر الدین کو کوغا پہنچے۔

غالب

اپریل ۱۸۵۹ء

(۷۳)

برخوردار کا میر مہدی

قطعہ تم نے دیکھا؟ کچھ میرا حلیہ ہے۔ وہ اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جس وقت نہیں نے یہ قطعہ ہاں پہنچے کے واسطے لکھا ”ارادہ تھا کہ کچھ بھی لکھوں۔ لڑکوں نے ستایا کہ دادا جان چلو کھانا تیار ہے“ میں بھوک گئی ہے۔ تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیوں لکھوں۔ اسی کاغذ کو لگانے میں رکھ کر ”ٹھٹ کا کر“ ”ہر نامہ لکھ“ ”کیان کے حوالے کر“ میں گھر چلا گیا اور ہاں ایک چیمیز بھی تھی کہ وہ لکھوں میرا میر مہدی سُنا ہو کر کیا باتیں مانتا ہے۔ سو وہی ہوا۔ تم نے جیلے پچھو لے

پھوڑے۔ لوٹاپ بتاؤ خط کھینے بیٹھا ہوں کیا نکھوں؟ یہاں کا حال زبانی میرا صاحب کے سن لیا ہوگا۔ مگر وہ جو تم نے سنا ہوگا بے اصل باتیں ہیں۔ غصہ کا مقدمہ نکلتے میں خواب گھر میں جھڑپ بہادر کے پیش نظر یہاں کے حاکم نے ایک روپکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی، میرا اس میں کیا ضرر۔ یہاں تک لکھ چکا کہ دو آدمی آگئے۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا، باہر نکلتوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی۔ چراغ روشن ہوا۔ غشی سید احمد حسین سرہانے کے طرف سوڑھے پر بیٹھے ہیں۔ میں چلک پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دو دان علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ اس کے سر پر توکرا اس پر گھاس ہری چھٹی ہوئی۔ میں نے کہا ادا ہا ہا ! سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے۔ فیض خاص نہیں، لطف عام ہے۔ شراب نہیں آ م ہے۔ خیر یہ مسلفہ بھی بے غلط ہے بلکہ غم اہل ہے۔ ایک ایک آ م کو ایک ایک سر بھر گلاس سجھا بادۂ انگوری سے بھرا ہوا۔ مگر وہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ بیسٹونہ گلاس میں ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اشی تھے۔ چدرہ بگڑ گئے، بلکہ سڑ گئے تاکہ ان کی برائی آوروں میں سرایت نہ کرے تو کرے، میں سے بچینک دیے۔ میں نے کہا بھائی یہ کیا کم ہیں۔ اگرچہ تمہاری تکلیف اور تکلف سے خوش نہیں ہوا۔ تمہارے پاس وہ یہ کہاں ہے جو تم نے آ م خریدے؟ خانہ آ باد دولت زیادہ۔

لیکھو ایک انگریزی شراب ہوتی ہے تو ام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی شیشی جیسا قد کا تو ام پتا۔ دیکھو اس لغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے سرور کی میں ہوتا ہو۔

بہتہد امصر اور حکیم میر اشرف علی کو کہہ ان کے علم کی کتنی ہیں اور نکلے نکلے کی کتابیں چالیس پچاس روپے کو لے گئے ہیں میری دعا کہہ دیا۔

غالب

ع ۱۸۵۹

(۷۵)

میری جان

تم کو تو بیماری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوا لے بیٹھے۔ اگر خط پہنچا ہے تو

جواب: ”اور نہ شکوہ و شکایت و حجاب و خطاب کہنے گئے۔ حکیم اشرف علی آئے تھے۔ سرمنڈ واڈالا ہے۔“ ”مختطفین رو سکھ“ پر عمل کیا ہے۔ نہیں نے کہا کہ سرمنڈ دایا ہے تو داڑھی رکھو۔ کہنے گئے: ”واسن از کجا آدم کہ جلد ہمارم۔“ واللہ ان کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔ کہتے تھے کہ امیر احمد علی صاحب آگئے اور بحال و قرار رہے۔ خدا کا شکر بجا لایا۔ کبھی تو ایسا بھی ہو کہ کسی عزیز کی ایسی خبر سنی جائے۔ میرا سلام کہنا اور مبارکباد دینا بھول نہ جائیو۔

تمھاری شکایت ہائے بچا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط مجھ کو پانی پت سے بھیجا تھا اور کربال کی روانگی کی اطلاع دی تھی۔ نہیں نے یہ تجویز کر لیا تھا کہ جب کربال سے خط آئے گا تو نہیں جواب لکھوں گا۔ آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت ابھی کھانا پکا بھی نہیں۔ تجویز پی کر بیٹھا ہوں کہ تمھارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔ کلیان بنار ہے۔ ایاز کو خط دیکر ڈاک گھر روانہ کیا۔ یوں تمھارا کھ بے جایا بجا؟ بھائی گلہ کرو اپنے سے کہو کہ تم نے کربال پہنچ کر خط لکھنے میں کیوں دیر کی؟ اور ہاں یہ کیا سبب ہے کہ بہت دن سے میرا نصیر الدین کا نام تمھارے قلم سے نہیں نکلتا؟ ان کی بندگی نہ لکھتے تو خیر و عافیت تو لکھتے۔ یہ باتیں ابھی نہیں۔ میرن صاحب کے باب میں حیران ہوں۔ تمہا تمھارے ساتھ گئے ہیں۔ والدہ ان کی پانی پت میں ہیں۔ وہاں کوئی مکان لے کر والدہ کو وہیں بلائیں گے یا خود بعد چند روز کے یہاں آ جائیں گے؟ یہ دو باتیں جواب طلب ہیں۔ میر نصیر الدین کی بندگی نہ لکھنے کا سبب اور میرن صاحب کے یوروہاں کی حقیقت لکھو۔ ہا میرا طعن اس کا ذکر نہ کرو۔ اگر ملے گا تو تم کو اطلاع دے دی جائے گی۔ شہر کی آبادی کا چہ چا ہوا۔ کرائے کو مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے۔ آئندہ کیا ہوگا۔

سلطان العلماء مجتہد العصر مولوی سید سرفراز حسین کو اگرچہ نظران کے مدارج عظیم و عمل پزیر بندگی چاہیے مگر خیر میں مزین داری و یکاگی کی راہ سے دعا لکھتا ہوں۔ میرن صاحب کو دعا اور بعد دعا کے بہت سا پیار۔ میر نصیر الدین کو دعا۔ فریاد کیا لکھوں۔

(۷۶)

بھائی!

نہ کاغذ ہے نہ نکت ہے۔ اگلے لٹافوں میں سے ایک ہر تک لٹاف پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ چھڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور ہر تک لٹاف میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ تم کہیں نہ ہوتا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ اور نکت منجائوں گا۔ شنبہ ۸ نومبر صبح کا وقت ہے جس کو عوام بڑی بھر کہتے ہیں۔ پرسوں تمہارا خط آیا تھا آج جی چاہا کہ ابھی تم کو خط لکھوں اس واسطے یہ چند سطریں لکھیں۔

برخوردار میر نصیر الدین پراں کی بیٹی کا قدم مبارک ہو۔ نام تاریخی تو مجھ سے محفوظ نہ جائے گا۔ ہاں عظیم النساء بیگم چھاپے کہ اس میں ایک رعایت ہے شاہ محمد عظیم صاحب رحمۃ اللہ کے نام کی۔ مجتہد العصر کو مہری دعا کہنا تم کو کیا ہوا ہے کہ ان کو اپنا چھوٹا بھائی جان کر مجتہد العصر نہیں لکھا کرتے؟ یہ بے ادبی اچھی نہیں۔ میرن صاحب کو بہت بہت دعا کہنا اور مہری طرف سے پیار کرتا۔

شہر کا حال کیا جانوں کیا ہے؟ "مچن ٹوٹی" کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور آپٹے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد بچپس بچپس فٹ گول میدان لگے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالافتا^۲ بنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چنگ کا کوچہ شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے چھاؤں چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔ حاکم اکبری آمد آمد کن رہے ہیں۔ دیکھو ولی آئیں یا نہیں؟ آئیں تو دربار کریں یا نہیں؟ دربار کریں تو میں گنہگار بلایا جاؤں یا نہیں؟ بلایا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہیں؟ ٹھن کانہ کہیں ذکر ہے نہ کسی کو خیر ہے۔

رشتہ ۸ نومبر ۱۸۵۹ ع

غالب

(۷۷)

مہری جان!

تو کیا کہہ رہا ہے؟ بیٹے سے سیانا سودیو اندہ۔ میر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا

ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون کہے گا جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو؟ کیا نہیں یہ جانتا ہوں کہ ان لوگوں کی پرورش نہیں کرتا ہوں؟ استغفر اللہ! لاؤ ثنی الوجود! اللہ۔ یا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں شیخ چلی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرفی مول لوں گا اور اس کے اندر سے بچے بچ کر بکری خرید کروں گا اور پھر کیا کروں گا اور آخر کیا ہوگا؟ بھائی یہ تو نہیں نے اپنا راز دل تم سے کہا تھا کہ آرزویوں ہی تمہی اور اب وہ نقش باطل ہو گیا۔ ایک حسرت کا بیان تھا نہ خواہش کا۔

دیکھا اس مجلس قدیم کا حال؟ نہیں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔ لیکن جب تک جراب نہ پاؤں، کھٹک اور کیونکر چلا جاؤں؟ حاکم اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے، دیکھئے کب آئے؟ آئے تو مجھے بھی دربار میں بلائے یا نہ بلائے؟ خلعت ملے یا نہ ملے؟ اس بیچ میں ایک اور بیچ آچکا ہے۔ اس کو دیکھ لوں اور پھر اسی کی انتظار نہیں اس سر ملے کے ملے ہونے کے بعد مجلس ملنے نہ ملنے کا تردد دستور ہے گا۔ سب سر کیوں کر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتی چھوڑ کر نکل جاؤں؟ مجلس جاری ہونے پر بھی تو سوارام پاد کے ٹھکانا نہیں ہے۔ وہاں تو جاؤں اور ضرور جاؤں۔ تین برس ثبات قدم اختیار کیا۔ اب انجام کار میں اضطراب کی کیا وجہ؟ پچھلے دور ہو اور مجھ کو کسی عالم میں تلنگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے، دینا عمل میں آتا ہے۔

صاحب میرن صاحب نے دو سطریں دجلہ خاص سے نگہی تھیں۔ داند نہیں کچھ نہیں سمجھا کہ یہ کس مقدمہ کا ذکر ہے۔

غالب

(۷۸)

بھائی

کیا پوچھتے ہو؟ کیا کہوں؟ دلی کی ہستی منحصر کنی پنکاسوں پر تھی۔ قلم نہ چاندی چونک نہ روز جمع جامع مسجد کا ہر نفلے سیر جتا کے پل کی ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں ہاتھیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلم روئے میں اس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہار ۱۵۔ دہر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیونکر وہاں کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سرت جاگیر دار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار

ہوتا تھا۔ مجھ بہادر گزہ پلپ گزہ فرغ نگر دو چاند پاٹو دی لو ہارو۔ چار مہدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے اس میں سے دو چاند لو ہارو تحت حکومت ہانسی حصار پاٹو دی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کشر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رکیس اور شاہ ایک رکیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں: میر خد میں مصطفیٰ خاں سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں نقی ہاروں میں سنگ دنیا موسوم پاسد۔ تینوں مردود مطرود و محروم و مظلوم:

توڑ پیٹھے جب کہ ہم جام و سہ پھر ہم کو کیا

آئناں سے بادۂ کھفام گھر ہر سا کرے

تم آتے ہو چلے آئے۔ ڈار خاں کے چھتے کی سڑک خان چند کے کوچہ کی سڑک دیکھ جاؤ۔ جاتی حکیم کے کوچے کا ڈھنچا جامع مسجد کے گرد سڑک گز میدان لکھنا سن جاؤ۔ غالب السردہ دل کو دیکھ جاؤ چلے جاؤ۔

مجتہد اصغر میر سرفراز حسین کو دعا، حکیم الملک اشرف علی کو دعا، قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا۔ یوسف بند میر افضل علی کو دعا۔

۶۔ ہمدانی الاولیٰ صبح جمعہ (۱۲۷۶ھ) ۲۔ دسمبر سال حال (۱۸۵۹ء) از غالب

(۷۹)

بے سے نہ کند در کف من خانہ روانی

سرد است ہوا آتش بے دود! کہانی

میر مہدی صاحب صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب چڑ رہا ہے۔ آگیشیں سامنے رکھی ہے۔ دو حرف کھتا ہوں، ہاتھ ہاتھ پاتا جاتا ہوں، آگ میں گری سکی ٹھکر پائے وہ آتش سیال کہاں کر جب دو جڑے بی لئے نور ارگ دپے میں دوڑ گئی اول تو اتنا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفس ماطلہ کو تو اجدہم پہنچا۔ ساتی کوڑ کا بندہ اور تھک لب اہائے غضب! اہائے غضب!

میاں تم پٹن پٹن کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پٹن کہاں؟ صاحب فری کشر بہادر صاحب کشر بہادر، نواب لکھت گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرادفہ

گورنمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار و خلعت کے لالے بنے ہیں، تم کو بھنس کا فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام فرد میں نہیں لکھا۔ نہیں نے اس کا اپیل تو اب لکھت گورنر بہادر کے پاس کیا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔ بہر حال جو کچھ ہو گا تم کو لکھا جائے گا۔

ابھی وہ یوسف ہندو تھی، یوسف دہر تھی، یوسف مصر تھی، یوسف ہفت کشور تھی، ان کی زلفا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے کہ میں ساڑھے سات روپے مہیت بھیجے جاؤں گا۔ اب اس کا لٹا خا ہے۔ رحیم بخش روڑا آتا ہے اور کہتا ہے کہ پچو پچا جان کو لکھو کہ پچو پچو جان بھو کی مرقی ہیں۔ خرچ جلد بھیج دو رشتہ تلاش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہر حال میرن صاحب کو یہ پڑھا دینا۔ میرسرفراز حسین کو دنا۔ حکیم میرا شرف علی کو دنا۔ یوسف ہفت کشور کو دنا۔

نائب

سہ شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۸۰)

میاں بڑ کے ۱

کہاں بھر رہے ہو؟ ادھر آؤ، خبریں سنو۔ دربار لاڑ صاحب کا میرٹھ میں ہوا۔ ولی کے علاقے کے جاگیردار، بموجب حکم کشتروالی میرٹھ گئے۔ موافق دستور قدیم مل آئے۔ فرخندہ پنج شنبہ ۲۹ دسمبر کو پہر دن چڑھے لاڑ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فہیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سننے ہی میں سوار ہو کر گیا۔ میرٹھی سے ملا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکندر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرست نہیں۔ یہ جواب سن کر نو مہدی کی پوت باعدہ کر لے آیا۔ ہر چند بھنس کے باب میں ہنوز لاؤ تم نہیں، مگر کچھ فکر کر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ لاڑ صاحب کل پارپوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام ممکن نہیں۔ تحریر ڈاک میں بھیجی جائے گی۔ دیکھیے کیا صورت پیش آئے گی۔

مسلمانوں کی املاک کی داغ بخت کا حکم عام ہو گیا ہے۔ جن کو کرائے پر ملی ہے، ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔ آج یک شنبہ یک جنوری ۱۸۶۰ء ہے، پہر دن چڑھا ہے کہ یہ حکم کو لکھا ہے۔ اگر مناسب جانو تو آؤ اپنی املاک پر قبضہ پاؤ۔ جاؤ، یہیں رہو، جاؤ پھر چلے جاؤ۔ میرسرفراز

حسین میر نصیر الدین، میرن کو میری دعائیں کہتا اور حکیم میر اشرف علی کو بعد دعا کے یہ کہہ دیتا کہ وہ
 محبوب جو تم نے مجھ کو دی تھیں ان کا نسخہ جلد لکھ کر بھیج دو۔ واللہ سو جودا سو اسعد دم۔
 یکم جنوری ۱۸۶۰ع اپنی مرگ کا طالب غالب

(۸۱)

اے بابا! میرا چارہ میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی حراج تو اچھا ہے؟ مٹھو! یہ رام پور ہے
 دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟ پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک
 دریا ہے اور کوئی اس کا نام ہے بے شبہ چشمہ۔ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر! اگر
 یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات مرید حاتا ہے لیکن انکا شیریں کہاں ہوگا؟
 خطا تھارا پہنچا۔ تر و دمیت۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک ٹنٹی میرا دوست۔
 نہ عرف کھینے کی حاجت نہ محلے کی حاجت ہے دوسرا نسخہ بھیج دیا کیجئے اور جواب لیا کیجئے۔ یہاں کا
 حال سب طرح خوب ہے اور صحبت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں دیکھوں کیا ہوتا ہے۔
 تعظیمِ حقِ قیر میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت
 اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

الغالب

فروری ۱۸۶۰ع

(۸۲)

میر مہدی! تم میرے عادات کو بھول گئے؟ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی
 تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ نہیں اس مہینے میں راجپور کیوں رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت
 دریغی کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی! نہیں ایسے اعزاز سے چلا
 کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یک شب کو فرہ ماہ مقدس ہوا اسی دن سے ہر صبح کو حادہ علی خاں
 کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نماز
 تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جڑی میں آتی ہے تو وقت صومِ مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھوتا ہوں اور
 سرد پانی پیتا ہوں۔ دادواہ کیا اچھی طرح مر رہی ہوتی ہے۔

اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انھوں نے میرا تانک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہیم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی اسر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کا تھا۔ اب بشرط حیات جزیرہ بعد برسات ہاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار دایہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپے مجھے ماہ بھجوتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے مہینہ بنام دولت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپے مہینہ پاؤں اور دہلی رہوں تو سو روپے۔ بھائی سو دو سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں مجھ کو تو کر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ دہلی۔ معاف و تقسیم جس طرح احتساب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے عین نے نذر دلائی تھی۔ بس۔ بہر حال قیامت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہئے، کئی کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپے سالانہ ٹھہرے۔ ایک صاحب اس نے نہ دینے مگر تین ہزار روپے سال اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپے سال۔

عزت میں وہ پایہ جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے بنادیا۔ "خان صاحب بسیار مہربان دوستانہ" القاب۔ خلعت سات پارچہ اور جیفہ و سرچ و مالائے مرادید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر بنادیا کرتے تھے۔ بخشی باغیر حکیم کسی سے تو قہر کم نہیں، مگر خاکہ وہی قلیل۔ سو میری جان یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کونخیزی میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا بھر دھرا ہے۔ جھڑپا رہا ہوں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کوئی چاہا یہ باتیں کر لیں۔ میرسر فر از حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین صاحب کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کہہ دینا۔

جسٹ ۱۸۶۱ء

از غالب

(۸۳)

میں

کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو؟ چشم بنار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرنے؟ قصداً نہ چشم بنار کے لاکھن کہاں؟ چشم بنار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں جس کو

ایسے ایسے عارف و دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیا کو کیا جانو؟ خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت حال مفصل لکھو۔ تم ذخیر کی عادت رکھتے ہو؟ اور مرض چشم سے تم کو کیا علاقہ؟ میرے نور چشم کی آنکھ کیوں دکھی؟ نہیں نے خط تمہیں جان کر نہیں لکھا؟ تم نے لکھا تھا کہ بعد عید نہیں وہاں آؤں گا۔ مجھ کو خط بھیجنے میں جامل ہوا۔ لکھتے کچھ ہو کر تے کچھ ہو۔

تخفہ کی سنو۔ دو برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سود و خرچ کے جو پائے تھے وہ کٹ گئے۔ ذرا حوسقہ فاقہ میں اٹھ گئے۔ عمار کا رد ہزار لایا۔ چنگے نہیں اس کا قرض دار ہوں روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجئے۔ حساب کیا۔ سود و مول سات کم پندرہ سو روپے ہوئے۔ نہیں نے کہا 'میرے قرض مترق کا حساب کر۔ کچھ لو پر گیا رو سو روپے نکلے ہیں۔ نہیں کہتا ہوں یہ گیا رو سو روپے بانٹ دے۔ نو سو بچے آدھے تو لے آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دے پان سات سو تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جانے کا تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آیا ہے۔ نہیں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھولیں۔ بات رو گئی پت رو گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی دوست شاد ہو گئے۔ نہیں جیسا نکھو کا ہوں جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے پچا کر امت اسد اللہی ہے۔ ان بیوں کا ہاتھ آنا علیہ السلامی ہے۔ حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز نہیں پانے کا مستحق نہیں حاکم صدر مجھ کو بخش دلوائے اور پورا دلوائے!

میرن صاحب کو دعا کہتا ہوں اور مزاج کی خبر پوچھتا ہوں۔ جواب ترکی ترکی جواب عربی عربی۔ جو انھوں نے لکھا وہ نہیں نے بھی لکھا۔ مجتہد مصر کو بندگی لکھوں دعا لکھوں کیا لکھوں؟ نہیں یعنی وہ مجتہد ہوں ہوا کریں میرے تو فرزند ہیں۔ نہیں دعا ہی لکھوں گا اور اسی طرح میر نصیر الدین کو دعا۔

غالب

مئی ۱۸۶۰ ع

(۸۴)

جان غالب

اب کے ایسا تیار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود ہلوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا

ہوں "خندہ مست ہوں" ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین آئے کئی ہاڑ گھر نہیں نے ان کو دیکھا نہیں۔ اب کی بار درے میں مجھ کو قنط سے بہت رہی۔ احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں سید صاحب نہیں آئے۔ مصاری آنکھوں کے قبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سرسبیں نکلیں، جتنی گرد آڑی اس کو آپ نے ازراہ محبت آنکھوں میں جگہ دی۔ بہر حال اچھے ہو جاؤ اور جلد آؤ۔ مجتہد انصاری سرسراؤ حسین کا خط آیا تھا۔ نہیں نے میرن صاحب کی آرزوگی کے طرف سے اس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ وقت ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا تاکہ میر سرسراؤ حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں اور میرن صاحب میرے پاس الفت پر اطلاع پائیں۔

عالم

چہار شنبہ ۶ جون ۱۸۶۰ع

(۸۵)

میاں!

تمہارے خط کا جواب مختصر تین باتوں پر ہے۔ دو باتوں کا جواب لکھتا ہوں "تیسری بات کا جواب تم بتاؤ کہ تمہیں کیا آنکھوں؟ پہلی بات "میاں بھرا افضل تصویر لے گئے۔ اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار۔ دوسری بات میر نصیر الدین آئے اور تینوں صاحبوں کا حیند کے جانے کا حال مفصل معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم فرمائے۔ تیسری بات میرن صاحب کو جب تک تم کہو میں دلی نہ جاؤں۔ گویا ان کے عاشق تمہیں ہو۔ نہیں نہیں۔ بھائی "ہوش میں آؤ" غور کرو۔ یہ مقدمہ درجہ میں نہیں کہ ان کو یہاں جا کر ایک الگ مکان دے بنے کو دوں اور اگر زیادہ نہ ہو تو میں روپے مہینہ مقرر کروں کہ بھائی یہ لو اور درجہ اور چاڈڑی اور اجیری دروازے کا بازار اور بلاقی تنظیم کا کوچہ اور خانہ دران حاس کی حویلی کے کھنڈر گھنٹے پھر۔ اے میر مہدی "تو در مانہ دو" عاجز پانی پت میں پڑا ہے "میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرسراؤ حسین کو کمری ڈھونڈنا پھرے اور نہیں ان ٹھہارے جاں گداز کی تاب لاؤں؟ مقدمہ ہوتا تو کھا دینا کہ نہیں نے کیا کیا" اے ہبا آرزو کہ خاک شدہ۔ اللہ اللہ۔ سر شنبہ ۳۔ جمادی الثانی (۷۷۷ھ)

عالم

۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ع

(۸۶)

جان غائب!

حصارِ احاطہ پہنچا۔ غزلِ اصلاح کے بعد پہنچتی ہے:

ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا۔

اے میرِ مہدی تجھے شرم نہیں آتی:

میاں یہ اہلِ دلی کی زبان ہے

ارے اب اہلِ دلی بند ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گہرے ہیں۔

ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو

جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ خس کی ٹپا پروا ہوا اب کہاں؟ وہ اہلِ قوافی تو اسی مکان

میں تھا۔ اب میرِ خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور ست بدلی ہوئی ہے۔ بہ ہر حال ہی گزرو۔

مصیبتِ عظیم یہ ہے کہ قادی کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈکی کے کنوئیں یک قلمِ کھاری ہو گئے۔ خیر

کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی لکھتا ہے۔ پوسوں میں سوار ہو کر کنوئیں کا حال دریافت کرنے گیا

تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے۔ اراج گھاٹ کے دروازے

تک بے مہاند ایک صحرائی وقت ہے۔ انٹوں کے ڈھیر جوڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو بھوکا

مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے ہاٹیچے کے اس جانب کوکلی پالس ٹیپ تھا وہ اب ہاٹیچے کے

محن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگوڑے کھلے ہو

ہیں باقی سب آٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ

دروازے سے کالی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کھڑا دھوپا واڑہ رام جی گنج مسعودت خاص

کا کھڑا بھرنل کی بی بی کی حویلی رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا پابغ، حویلی

ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شمع ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر

نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کر بلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ۔ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا

کہتے جاتے ہیں۔ واہوے حسن افتقاد۔ ارے بند خدا! اردو باز اردو کہاں؟ وئی واللہ اب

شہر نہیں ہے، کسپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔

اور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور اہلکتاب سے کیا کام؟ الگوڑ رچوڑے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہراً ان کی مصاحبت نہیں، ورنہ کچھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

۱۸۶۰ع

جالب

(۸۷)

اومیاں سید زاوۃ آزادہ، دلی کے عاشق ولد اورہ، ڈھمے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو ٹرا کھینے والے، دہلی میں مہرو آزادہ، نہ آگھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین مکتون کہاں! ذوق کہاں! سو من خاں کہاں! ایک آزادہ و سوسا سوش دوسرا جالب، وہ بیخود و بوش نہ بخور رہی نہ بخور اتنی، کس برے پر خا پانی؟ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی۔

سنو صاحب، پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد و لاور خاں ولد مروار خاں اور نانا اس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں ولد صاحب خاں۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشروح و مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے؟ معاش کیا ہے؟ طریق کیا ہے؟ احمد حسین خاں کی لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ذہنک ہے؟ بھائی خوب چھان کر لکھ اور جلد لکھ۔

پنجشنبہ ۲۳ مئی ۱۸۶۱ع

جالب

(۸۸)

”اے جناب میرن صاحب! السلام علیکم؟“

”حضرت آداب!“

”کہو صاحب! آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟“

”حضور نہیں کیا منع کرتا ہوں؟ نہیں نے عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔“

”خار جاتا رہا ہے، صرف بچش باقی ہے۔ وہ بھی رخص ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی

طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں؟“

”نہیں، میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خطا ہو ہو

کا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔“

”حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے تھا کیا ہوں گے۔“

”بھائی! آخر کوئی وجہ تو تھا کہ تم مجھے خط لکھتے سے کیوں باز رکھتے ہو؟“

”سبحان اللہ! اسے لو حضرت! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا

ہے۔“

”اچھا! تم باز نہیں رکھتے! مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میری مہدی کو خط

لکھوں؟“

”کیا عرض کروں! سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا

اور خط اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جاوے۔ نہیں بے شکہ کو روانہ ہوتا

ہوں۔ میری روادگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔“

”میاں! فیض ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ نہیں یوں سا

آوی بھولا آوی تمہاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ احوال دلاؤ تو۔“

”سنو! میری مہدی صاحب! میرا کچھ گنا نہیں۔ میرے خط کا جواب لکھو۔ چپ تو رفع ہو گئی؟

تجربہ رفع ہونے کی خبر مشابہ لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ

کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمہارا پرہیز اگر ہو گا بھی تو عصمت بی بی از بے چارہ رہی ہو گا۔

حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی ذہانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو پیٹھے ہیں۔ کیا

جانوں۔ حکیم میرا شرف علی میں اور ان میں کچھ کونسل تو ہو رہی ہے۔ بے شکہ روادگی کا دن ظہر تو

ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھو کہ جناب ملکہ انگلستان کی ساگرہ کی روشنی

کی محفل میں تمہاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر لی جیو کہ جو قاری مثل مشہور ہے کہ ”دفتر

راگا ذخیرہ“ اس کے متنی کیا ہیں؟ پوچھو اور نہ چھوڑو جب تک یہ نہ بتائیں۔

اس وقت پہلے تو آدھی چلی پھر مینا آیا۔ اب مینا برس رہا ہے۔ نہیں خط لکھ چکا ہوں۔

سرنامہ لکھ کر چھوڑوں گا۔ جب ترغ سقوف ہو جائے گا تو کایان ذاک کو لے جائے گا۔ میرا سر فراز

حسین کو دعا پہنچے۔ اللہ! تم پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے

اوس حصص قبلہ کو بے گنہے گئے یا نہیں؟ میر نصیر الدین کو دعا کہنا۔

مئی ۱۸۶۱ء

غالب

(۸۹)

برخوردار

حصص را خط آیا حال معلوم ہوا۔ نہیں اس خیال میں تھا کہ اور کا کچھ حال معلوم کر لوں اور کہتاں اگلوں کا خط آئے اور میں اس کو میر سرفراز حسین کے مقدمے میں لکھوں تو اس وقت حصص را خط کا جواب لکھوں۔ چونکہ آج تک ان کا خط نہ آیا۔ نہیں سوچا اگر اسی انتظار میں رہوں گا اور خط کا جواب نہ لکھوں گا تو میرا بیاد مہدی خاں ہوگا۔ نہ پار جو کچھ اور کا حال سنا ہے وہ اور کچھ اپنا حال لکھتا ہوں۔

ہر چند نہیں نے دریافت کرنا چاہا حکیم محمود علی کا وہاں پہنچنا اور یہ کہ وہاں کتنے کے بعد کیا طور قرار پایا کچھ معلوم نہیں ہوا۔ صرف خبر واحد ہے کہ ان کو راز دارا خان صاحب ایجنٹ سے اجازت لے کر بلا لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحب ایجنٹ اور نے راجہ کے بالغ اور عاقل ہونے کی رپورٹ صدر کو بھیجی ہے۔ کیا سبب ہے کہ ان کا راجہ ان کو مل جائے۔

مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پیاس ساٹھ جلد کی کتاب میر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آگئی۔ سترہ پوٹھیں ہادہ تاب کی تو شک خانہ میں موجود ہیں ان بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں:

کسے کہیں مراؤں میر

اگر جم نہ ہاشد سکندر

میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور میر نصیر الدین کو دعائیں اور دعا کی

(غالب)

آرزو نہیں۔

(۹۰)

میاں۔

کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے۔ یہاں

ان کی سرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریابہا دیے۔ طوہد امن صاحب بلائیں لیتی تھیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعا نہیں دیتی تھیں۔ بی بی مانند صورت دیا اور چپ لٹی چاہتا تھا چیخے کو کمر ہاتھ چپ وہ تو قیمت تھا کہ شہر میں نہ کوئی جان نہ بچان اور نہ ساسے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک ٹیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا رو پیہ بازو پر ہاتھ تھا۔ گیارہ روپے خرچ راہ دیے۔ مگر ایسا جاتا ہوں کہ میرن صاحب اپنی جد کی ناز کا رو پیہ راہ علی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا کہ یہی ہوگا کہ میرن صاحب بات تم سے چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے۔ ساس فریب نے بہت سی جلیبیاں اور قندہ قندہ ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قندہ قندہ ہماری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے۔" بھائی میں دلی سے آیا ہوں اور قندہ قندہ ہماری سدا سے لایا ہوں۔" زنجبار باور نہ کیجیو مال مفت سمجھ کر لے لیو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کھڑکیاؤں کے سر پر قرآن رکھو کلیان کے ہاتھ میں گنگا جلی دو بلکہ نہیں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگا یا اور سنو مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازہ کے باہر صدر ہزار تک ان کو پہنچا گئے۔ دم مشابعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون نہ اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو ان پر اپنی جان ٹاڑ کرتے ہیں خود تیں صدقہ جاتی ہیں۔ مرد دینار کرتے ہیں۔

مجتہد العصر سلطان العلماء مولوی سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ حضرت ام تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فتنہ پڑھ کر کیا کرے گا؟ غلب و نجوم و جیت و منطق و فلسفہ پڑھ جو آدی ہاتھ ہے خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام نہیں ہے مذہب حق والسلام والا کرام علی علی کیا کر فارغ الہال ربا کر۔

ستید صاحب:

اچھا دھکوسلا نکالا ہے کہ بعد القاب کے شکوہ شروع کرونا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ نہیں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علی کا نظام اور سادات کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آ گئے۔ کمال یہ کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے۔ دوست ہوں۔ عاشق زار نہیں۔ بندہ مہر و وفا ہوں مگر قنارہ نہیں۔ تمہارے بھائی نے سخت مشوش بلکہ فعل در آتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم کے نہیں بھی آؤں گا۔ نہیں نے سلام رہنے دیا اور خطر رہا کہ اک میں کیوں بھیجوں وہ آئیں گے تو ہمیں ان کو دوں گا۔ محرم تمام ہوا آج سر شنبہ طرہ صفر ہے۔ حضرت کا پنا نہیں۔ ظاہراً برسات نے نہ آنے دیا۔

برسات کا نام آ گیا۔ سو پہلے بھٹا ستو: ایک غدر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ اندام مکانات کا ایک آفت دہائی ایک مصیبت کال کی اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج ایکسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تار سے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو بھٹو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آتی۔ کوئی دن نہیں کہ وہ چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ سمجھنا۔ ہزار پا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جاہلادب کمر مر گئے۔ گلی گلی بڑی بہہ رہی ہے۔ قندہ مختصر وہاں کال تھا کہ چند برسات اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ دن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بونے ہوئے دانے بہہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیاوٹی کا حال؟ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں۔ جناب میرن کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں؟

غالب

سر شنبہ یکم صفر ۱۳۷۷ھ ۲۹ جولائی ۱۸۶۳ ع

خواجہ غلام غوث خاں بے خبر

(۹۳)

قبلا

اس بندہ غفقر نے وہ کیا جو بارہ کیر کھٹ تنگ سے کرے یعنی خط اور پارسل کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اس کی خبر پا کر بخت کی رسائی کا سپاس گزار نہ ہوں۔ یہ تو حضرت کو لکھ چکا ہوں کہ دوسرا پارسل اور خط ایک ساتھ بھیجا گیا ہے اور ہر گز توقع کا خیال اسی پارسل پر ہے جس واسطے کہ اس خط میں حاکم اعظم کے نام کی مرضی ملفوف ہے۔ جانتا ہوں کہ ٹھکانے ایک ایک دو لوگوں لٹکانے ایک دن پہنچے ہوں گے مگر دل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ نہ مانوں گا جب تک کہ حضرت اس سر رشتے سے معصوم کر کے نہ لکھیں گے۔ اب آپ جانے اور یہ دل سودا زور نہ نہیں اس کی سفارش کرنے والا اور اس کے مدعا کا گزارش کرنے والا کون؟ ہاں اتنی بات ہے کہ آپ لکھ سکتے ہیں بلکہ یہ بھی آپ مجھ پر حالی کر سکتے ہیں کہ زور و لایت کی ولایت کو روانہ ہوئی یا نہیں؟ میری جگر کاوی کی قدر دانی ہوئی یا نہیں؟ چٹکاہ سے موافق دستور کے خط کا اسیدہ دار ہوں یا نہیں؟ اپنے حسن طبع کا شکر گزار ہوں یا نہیں؟ اس خط کا جواب جتنا جلد منایت کیجئے گا مجھ کو جلا لیجئے گا۔ نو بارہ کا خط ایک معتد کے ہاتھ بھیج دیا گیا۔

(دسمبر ۱۸۵۸ ع)

(غالب)

(۹۳)

بناب حالی

آج دو شنبہ ۲۳ ذی ۱۸۵۹ ع کی ہے۔ پیر دن چڑھا ہو گا کہ بار گمر رہا ہے ترغ ہو رہا ہے ہوا سرد چل رہی ہے پینے کو کچھ میسر نہیں نا چار روٹی کھائی ہے:

اتنی بات نہ از ابر بہن بھی سفالیہ جام من از سے جنی
غمر وہ درد مند بیضا تھا کہ ڈاک کا ہر کارہ ہمارا خط لایا۔ سربانے کو دیکھ کر اس راہ سے
(کہ) دستخط خاص کا لکھا ہوا ہے بہت خوش ہوا۔ خط کو چھ کر اس زور سے کہ حصول مدعا کے ذکر پر

سادہ تھا، انفرادی حاصل ہوئی۔

ما غائبہ رمیدگان عظیم
پیغام خوش از دیار ما نیست
اس انفرادی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کرو۔ ہا آ نکہ خط جواب طلب نہ تھا
جواب کہنے لگا۔

پہلے تو یہ سنے کہ آپ کے دوست کو آپ کا خط پہنچ گیا، مگر وہ وہ بار مجھ کو لکھ چکا ہے کہ
نہیں جواب اس کا نشان مرقوم تھا کہ کے مطابق ڈاک میں بھیج چکا ہوں۔ جواب الجواب کا ختم
ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس متقاضی استغنا ہے، پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی
کہ ہامید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستثنیٰ ہوتا چلا ہوں کہ وہ وحالی برس کی زندگی آور ہے
ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو فسی آئے گی کہ یہ کیا بکنا ہے؟ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا
ہے؟ چاہے الہام کچھ چاہے اوہ نام کچھ نہیں برس سے یہ قطعہ لکھ کھا ہے:

من کہ ہاشم کہ جادواں ہاشم چوں نظیری تمام و طالب مرد
ور بگویند در کدای سال مرد غالب؟ بگو کہ "غالب مرد"

اب بارہ سو پچیس ہیں اور "غالب مرد" بارہ سو پچیس ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ صرت
پیش ہو پہنچنے لے در نہ پھر ہم کہاں!

(غالب)

۳ جنوری ۱۸۵۹ ع

(۹۳)

بندۂ گنہگار شرمسار عرض کرتا ہے کہ پرسوں غازی آباد کا اٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر پر
مثل بلائے تا کہانی نازل ہوا ہوں:

ہائے کہ کسم جزاں خیریں بر طویش
اما پہ زبان چادہ راہ وطن

خواجہ صاحب کی رحلت کا اندوہ بہتہ رقب و قرابت آپ کو اور پانچ روزہ مہر و مہبت مجھ
کو۔ وہ منظور میرا قدر دان اور مجھ پر مہربان تھا۔ حق تعالیٰ اس کو اعلیٰ علیین میں بسبیل دوام قیام

وے۔ رام پور میں تھا کہ ”اودھ اخبار“ میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے! ابدار اس کو کہتے ہیں۔ جذبات طرز اس کا نام ہے۔ جوڑ حک تازہ نوایان ایران کے خیال میں گذر راقا‘ وہ تم بردے کار لائے۔ خداتم کو سلامت رکھے اور میرے دشمنی صاحب ”مردان قاطع“ کے جھکڑے میں بخلاف اور قاری دانوں کے توفیق انصاف عطا کرے۔ لو اب اس کا جواب جلد بھیجو تا یہ طریقہ مسلسل ہو جائے۔

(غالب)

۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء

(۹۵)

مولانا بندگی!

آج صبح کے وقت شوق دیدار میں بے اختیار خدیریل ندو اک تو سہی ہست پر سوار چل دیا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم تک پہنچ جاؤں گا مگر یہ نہیں جانتا کہ کہاں پہنچوں گا۔ اتنا بے خود ہوں کہ جب تک تم جواب نہ دو گے نہیں نہ جانوں گا کہ کہاں پہنچا اور کب پہنچا۔

آپ کا پہلا خط رام پور سے دئی آیا۔ نہیں راہ میں تھا۔ پھر دئی سے خط رام پور پہنچا۔ نہیں وہاں بھی نہ تھا۔ خط دئی روانہ ہوا۔ اب کئی دن ہوئے کہ میں نے ڈاک سے پایا اس حال میں کہ میں بیمار تھا۔ معذرا جاؤں کی شدت مہاوٹ کا مہینہ دھوپ کا پتہ نہیں پڑے چھٹے ہوئے دشمن جا رہا ہے۔ آج تیرا عظم کی صورت نظر آئی۔ دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ خط لکھ رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کیا لکھوں؟ اس خط کے مضامین امداد و فزائے دل کو متحمل کر دیا۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مفقود تھمارے ناموں ہیں۔ مگر ان کے اور تھمارے معاملات میرا دلا جیسے کہ تمہاری تحریر سے اب معلوم ہوئے میرے دل دشمن نہ تھے۔ ایسے محبت کا فراق اور پھر بقید و دام کیوں کر جا سکتا ہو۔ حق تعالیٰ ان کو بخشے اور تم کو صبر دے۔

حضرت نہیں بھی اب چراغ سحری ہوں۔ درجہ ۱۲۸۲ء حال کی آخو میں تاریخ سے اکبرہ دس سال شروع ہو گیا۔ طاقت سلب انہو اس مفقود امر ارض مستولی۔ بقول بخاری:

یکے مرد شخصہ بمری رواں

آج نہیں اور بھی باتیں کرتا مگر میرا خاص تراش آ گیا۔ سینے بھر سے چامت نہیں
ہوئی۔ خط لپیٹ کر ڈاک میں بھیجتا ہوں اور خط ہلواتا ہوں۔

(غالب)

(۸۶۶ع)

انور الدولہ نواب سعد اللہ خاں شفق

(۹۶)

پیر مرشد

کیا حکم ہوتا ہے؟ آفتاب بن کر چپ ہو رہوں یا جواز روئے کشف یعنی مجھ پر حالی ہوا ہے
وہ کہوں؟ اول رجب میں آپ نے نو انوش نامہ کب بھیجا؟ آخر میرے پاس پہنچ ہی گیا یہ جو اب
بھیجا۔ اگر روانہ ہوا ہوتا تو وہ بھی پہنچ گیا ہوتا۔ پھر حال محبت کی گرمی ہنگامہ ہے یہ جملہ محض آرائش
عنوان نامہ ہے۔

عمرت و دار و بار کہ ایسی ہم غنیمت است

بخشن داروں کا اجراء بخشن اور اعلیٰ شہر کی آبادی ممکن یہاں اس صورت پر نہیں ہے
جیسی اور کہیں ہے۔ اور جگہ سیاست ہے کہ تجملہ ضروریات دیاست ہے یہاں قہر الٰہی ہے کہ فناء
جائی ہے۔ خاص میرے بخشن کے باب میں گورنمنٹ سے رپورٹ طلب ہوئی ہے۔ اثناء دروزگار
حیران میں کہ یہ بھی ایک بات عجیب ہوئی ہے۔ رپورٹ کی روانگی کی دیر ہے چند روز اور بھی قسمت کا
بھیر ہے۔ دلی علاقہ فطرت گورنر سے انتظار پاگئی اور احاطہ پنجاب کے تحت حکومت آ
گئی۔ رپورٹ یہاں سے لاہور لاہور سے کلکتہ جائے گی اور اسی طرح پھیر کر نوید حکم منظوری
آئے گی۔

فعل لازم کو جب متعدی کیا جائے تو پہلے مضارع میں سے مصدر بنا لیتا
جائے۔ ”گشتن“ مصدر ماضی ”گرد“ مضارع ”گردیدن“ مصدر مضارع ”گردان“ ”گردانیدن“
”گردانیدن“ مصدر متعدی۔ موافق اس قاعدہ سے کہ ”گردان“ کا متعدی ”گردانیدن“ ”گردان“ ”گردانیدن“

سرے سے نیچے: آپ کا قصیدہ بعد اصلاح سمجھا۔ اس کی رسید آئی۔ کئی سکتے ہوئے شعر اُٹے آئے۔ اُن کی قباحت پر چھی گئی۔ قباحت بتائی گئی۔ الفاظ فصیح کی جگہ بے محیب الفاظ نکدے گئے۔ لو صاحب! یہ اشعار بھی قصیدہ میں لکھ لو۔ اس نکارش کا جواب آج تک نہیں آیا۔ شاہ اسرار الحق کے نام کا کاغذ ان کو دیا۔ جواب میں جو کچھ انھوں نے زبانی فرمایا آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف سے اس تحریر کا بھی جواب نکلا:

بند ہوں نہیں شکوے سے ہو رنگ سے پیسے باجا

اک ذرا پھیلے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

سوچتا ہوں کہ دونوں خط ہر یک گئے تھے۔ تلف ہونا کسی طرح تصور نہیں۔ خیر اب بہت دن کے بعد شکوہ کیا لکھا جائے؟ باہی کڑھی میں اُبال کیا آئے؟ بند گئی بھارگی۔

پانچ لشکر کا مسئلہ ہے وہ ہے اس شہر پر نوا: پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لگا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و دین و آسمان و زمین و آسمان و تاریستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر پیسے کا اس میں بہت سے پیسے بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت مٹوا لٹ گئی۔ مرے آدمی کم، لیکن جس کو تپ آئی اس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے مگر دو آدمی تپ میں جلتا ہیں: ایک بڑا لڑکا اور ایک میرا داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

برسات یہاں بھی اچھی ہوئی ہے لیکن نہ ایسی کہ بھیسی کالپی اور بنارس میں۔ زمیندار خوش کھیتیاں تیار ہیں۔ خریف کا بیڑا پار ہے۔ ریلج کے واسطے پودہ ماہ میں بیوہ دکار ہے۔ کتاب کا پارسل پوسوں اور سال کیا جائے گا۔

ابا بابا! جناب حافظ محمد بخش صاحب امیری ہند کی۔ مغل علی خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستحق ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر نکسوں؟ حکیم رضی الدین خاں کوئلہ حام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ خالغ پادشاہ کے دو بیٹے رخصت لے کر آئے تھے غدر کے جب نہ جاسکے نہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں

کو پھانسی ملی۔ طالع پارخاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔ میر جھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال سا جیز اور میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب کا بر شہر سے بھاگے تھے وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑوہ میں رہے اور تک آباد میں رہے حیدر آباد میں رہے سال گزشتہ یعنی چانڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی۔ لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو مقب کوٹوالی چچترہ ہے وہ اور غولہ قاسم کی حوٹلی جس میں مغل ملی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور غولہ صاحب کی حوٹلی یہ اٹاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہوئی اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا۔ اس قاسم جان کی حوٹلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام ہیں وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں نظام الدین پانچن گئے ہیں۔ شاید بہاول پور بھی جائیں گے۔

(غالب)

ع ۱۸۶۰

(۹۸)

پیر مرشد

شبہ رفتہ کوینہ برسا۔ ہوا میں فطرت بروقت سے گزرتا پیدا ہو گیا۔ اب صبح کا وقت ہے۔ ہوا ٹھنڈی ہے گزرتا چل رہی ہے۔ ابر ٹھک محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے پر نظر نہیں آتا ہے۔ نہیں عالم تصور میں آپ کو مسند مزو جاہ پر چائین اور شیشی نادر حسین خاں صاحب کو آپ کا جلیس مشاہدہ کر کے آپ کی جناب میں کورنش بہالانا ہوں اور شیشی صاحب کو سلام کرتا ہوں۔ کافرقت ہو جاؤں اگر یہ مدارج بہالاناؤں۔ حضرت نے اور شیشی صاحب نے میری خاطر سے کیا زحمت اٹھائی ہے۔ بھائی صاحب بہت خوشنود ہوئے۔ منت پذیر میں میرے شریک غالب ہیں۔ فی الحال بہت سلا میرے سلام نیاز عرض کرتے ہیں۔ مطلب ہے کہ نامہ جدا گانہ بھی ارسال کریں۔

حضرت آپ غالب کی شرارتیں دیکھتے ہیں؟ سب کچھ کہے جاتا ہے اور اس اصل کا کہ جس پر یہ مراجع متفرع ہوں ذکر نہیں کرتا۔ فقیر کو یہ طرز پند نہ آئی۔ مطلب اصلی کو مقدر چھوڑ جانا

کیا شیوہ ہے؟ یوں لکھتا تھا کہ آپ کا حمایت نامہ اس کے ساتھ نسب نامہ خاندان مجددِ عہد کا پارسل پہنچا۔ نہیں ممنون ہوا، تو اب ضیاء الدین خاں بہادر ممنون و شاہ کر ہوئے۔ جناب عالی نہیں تو غالب ہرزہ مر کا معتقد نہ رہا۔ آپ نے اس کو مصاحب بناد رکھا ہے۔ اس سے اس کا دماغ جل گیا ہے۔ قبلہ و کعبہ جناب مولانا قلقل کی خدمت میں حضرت شفق نے جو غالب کی شفاعت کی تھی وہ مقبول نہ ہوئی۔ اب جناب ہاشمی کو اپنا ہم زبان اور مددگار بنا کر پھر کہتے ہیں آپ کی بات اس باب میں کبھی نہ مانوں گا جب تک سید صاحب کا خوشنودی نامہ نہ بھجوائے گا۔ اس سارا شفق کے حصول میں رشوت دینے کو بھی موجود ہوں۔ والسلام

(۹۹)

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

شبست است بر جریدۂ عالم دوام ما

خداوندِ نعمت!

آج دو شنبہ ۶ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے۔ اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں عطاوقت نامہ پہنچا۔ ادھر چڑھا، ادھر جواب لکھا، ڈاک کا وقت نہ رہا۔ خط کو ممنون کر رکھا ہوں۔ کل شنبہ ۶ فروری کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ سال گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ حیرہ مینے صاحب فرماں رہا۔ اوصافِ شوارحاً چٹنا پھرنا کیسا؟ نہ چپ نہ کھانسی نہ سہال نہ فالج نہ لقوہ ان سب سے بدتر ایک صورت پڑ کہ دردِ یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے۔ ہر پھوڑہ ایک دھم ہر دھم ایک خانہ ہر روز بے مہالہ بارہ حیرہ چھائے اور پاؤں بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے بے خورد و خواب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی تو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں نہیں اٹھی۔ جاگ اٹھا، تڑپا کینہ پھر جو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں سے تین چھ دن یوں گزرے پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرے روحِ غالب میں آئی، اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگر تندرست ہوں لیکن باقران دست ہوں۔ جو اس کو بیضا حافظہ کو برو بیضا۔ اگر اٹھتا

ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قد آدم دیر ادا کرے۔ آپ کی ہڈیوں کے کیوں نہ
 قربان جاؤں کہ جب تک میرا نہ سنا میری ٹھنڈی۔ میری مرگ کے جگر کی تقریر اور شلا میری
 یہ تقریر آدھی بچ اور آدھی جھوٹ۔ در صورت مرگ ہم مردہ اور در حالت حیات ہم زندہ ہوں:

در کشاکش فطرم نکسند رولاں از تن

اینگے من نمی میرم ہم نہ تا تو اینہاست

اگر ان سطور کی نقل میرے خدمت مولوی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر تقی عثمانی
 گورنری خربہ شمال کے پاس بھیج دیجئے گا تو ان کو خوش اور مجھ کو مسنون کیجئے گا۔

دوشنبہ ۶ رمضان ۱۲۸۰ھ ۵ افروری ۱۸۶۳ ع

حکیم غلام نجف خاں

(۱۰۰)

صاحب:

کل آ خر روز تمہارا خط آیا۔ میں نے پڑھا آنکھوں سے لگا یا، پھر بھائی ضیاء الدین
 خاں صاحب کے پاس بھجوایا۔ یقین ہے کہ انہوں نے پڑھ لیا ہوگا۔ مکتب فیہ معلوم کیا ہوگا۔
 تمہارے یہاں نہ ہونے سے ہمارا دل گھماتا ہے۔ کبھی کبھی ناگاہیکہ طور پر ضیاء الدین کا آنا یاد آتا ہے۔ کہو
 اب خبر سے کب آؤ گے؟ کس برس؟ کس مہینے؟ کس دن راہ دکھائے گے؟ یہاں کا حال جیسا کہ کچھ گئے
 ہوئے دستور ہے:

زمین سخت ہے آسماں اُور ہے

جاڑا پڑ رہا ہے تو اگر غرور سے 'مظلس سردی سے اکثر رہا ہے۔ آبکاری کے بندوبست
 جدید نے مارا عرق کسے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر اسد اور دروازہ آبکاری ہے، ادھر دلا بیتی
 عرق کی قیمت ہماری ہے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی فضل رسول صاحب حیدر آباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں

ہیں۔ مگر الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو دہاں بلایا ہے۔ چہ نہیں معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم کو معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔ زیادہ کیا لکھوں؟

کیوں غمخیز الدین کیا نہیں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھ کو الگ لکھتا یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے اپنی ہندگی لکھتا؟ حکیم غلام نجف خاں خط لکھتے بیٹھے 'خیری ہندگی لکھ دی۔' خیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ اس ہندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی؟

غالب

صبح یک شنبہ ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۳ ع

نواب یوسف میرزا

(۱۰۱)

یوسف میرزا

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سوداگی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ حکمرانہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ غم مرگ میں قلم نامہ سارک سے قلع نظر کر کے اہل شیر کو گستاہوں، مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں، ابنِ اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا نہیں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے 'لو' بھول گیا۔ حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے! گھر ان کے بے چراغ، نوہِ خودا، وارہ۔ سہاؤ اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ کلزے کلزے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زعموں کے فراق میں عالم میری نظر میں خیر ہوتا رہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اس کی بیٹی اس کے چار بچے اس کی ماں یعنی میری

بھابھ 'جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہو گی کہ میرا بھی کوئی بچا ہے، یہاں اغنیا اور امرا کے اڑواج اور اولاد بھیک مانگتے پھریں اور نہیں دیکھوں اس مصیبت کی تاب لانے کو بھگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ دتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے تین چار آدمی گھر کے 'کلو' کلیان لیا زانیہ باہر داری کی بند روٹے بچے بدستور گویا داری موجود ہے۔ میاں کسمن گئے گئے میں جا بھر سے آگئے کہ بھوکا مر رہا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک چھپے کی آمد نہیں، میں آدمی روٹی کمانے والے موجود۔ مقام مظلوم سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بقدر سدا رقی ہے۔ منت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعف، قوی اب مجھ کو دکھ تو جانا میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھنٹہ ٹیٹھا ہوں، ورنہ چار ہوتا ہوں، گویا صاحب فراموش ہوں۔ نہ نکلیں جانے کا لٹکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق، جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا، اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعت، فاخرہ، پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں، نہ گنگار ہوں، نہ مخبر، نہ مشد۔ بھلا اب تم ہی کہا اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو غدر کہاں سے لاؤں؟ دو مہینے دن رات خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصور کو دیا، وہ پہلی دسمبر کو مجھے دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے:

د سال تو دگر آپے بروئے کار آہ

ہزار و ہشت صد و شصت در شمار آہ

اس میں التماس اپنی تمام سرگزشت کے لکھنے کا ہے۔ اس کی نقل تم کو بھیجوں گا۔

میرے آقا زادہ روشن گمر، جناب مفتی میر عباس صاحب کو دکھانا۔ اس مجھے ہوئے بلکہ

مرے ہوئے دل پر کلام کا نیا سلوب ہے۔

جہاں پناہ کی مدد کی فکر نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا، میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بخا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بار بار ایسا کیا ہے کہ ایک قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا

غضب ہوا۔ بھر کبھی حالت اور کبھی مصیبت میں کہ جس کا ذکر بطریق اختصار لازم پر لکھا یا ہوں۔ اس قصیدے سے مجھ کو غرض دستک بخشن منظور نہیں گدائی منظور ہے۔

یہ ہر حال یہ تو کبھی قصیدہ پہنچایا نہیں؟ پرسوں تمہارے ہاموں کا خط آیا اس میں قصیدے کے پہنچنے کا ذکر نہیں۔ اس تقریر کو مٹاؤ اور صاف لکھو کہ قصیدہ پہنچایا نہیں؟ اگر پہنچا تو حضور میں گزرا یا نہیں؟ اگر گزرا تو کس کی معرفت گزرا؟ اور کیا حکم ہوا؟ یا مسودہ جلد لکھو اور ہاں یہ بھی لکھو کہ اہلاک واقع شیر دہلی کے باب میں کیا حکم ہوا؟

نہیں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ کل نہیں نے فرد فہرست دیہات و باغات و اہلاک مع حاصل ہریک پارچہ دو دو ملک ناظرینی کو بھیج دی ہے۔ اس خط سے ایک دن پہلے وہ فرد پہنچے گی۔ یہ فرد ٹکٹری کے دفتر سے لی ہے مگر اتنا معلوم ہے کہ شہر کی عمارت جو سڑک میں نہیں آئی اور برسات میں دسے جنس گئی وہ سب خالی پڑی ہے۔ کراپہ دار کا نام نہیں۔ مجھ کو یہاں کی اہلاک کا علاقہ حسین میرزا کے واسطے مطلوب ہے۔ نہیں تو انھیں کے باب میں حکم اخیر بن لوں پھر رام پور چلا جاؤں گا۔ برادری الاول سے سڈی الیونک آٹھ مہینے اور پھر عزم سے بے ۱۲ سال شروع ہوگا۔ اس کے دو چار حد دس گیارہ مہینے غرضیکہ انھیں میں مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج و راحت و لذت و عزت جو مقصود میں ہے وہ پہنچ جائے اور پھر علی علی کہتا ہوا ملک عدم آباد کو چلا جاؤں۔ جسم رام پور میں اور روح عالم نور میں "یا علی" "یا علی" "یا علی"۔

میاں ہم حصیں ایک اور خبر لکھتے ہیں۔ برصا کا چتر دو دن بنار پڑا ہا "تیسرے دن امر گیا۔ ہے ہے کیا نیک بخت غریب لڑکا تھا۔ باپ اس کا شیوہی رام اس کے فم میں مردہ سے بدتر ہے۔ یہ دو مصاحب میرے یوں گئے: ایک مردہ ایک دل افردہ کون ہے جس کو تمہارا اسلام کہوں؟ یہ خط اپنے ہاموں صاحب کو پڑھا دینا اور فردان سے لے کر پڑھ لینا اور جس طرح ان کی رائے میں آئے اس پر حصول مطلب کی بنا مانگنا اور ان سب مدارج کا جواب شتاب لکھنا۔

ضیاء الدین خاں رچک چلے گئے اور وہ کام نہ کر گئے۔ دیکھئے آ کر کیا کہتے ہیں یا راست کو آ گئے ہوں یا شام تک آ جائیں۔ کیا کروں کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں۔ ہر قسطی علی پہلے سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہ اودہ سے ہاتھ آئے محصور اور اندہ کروں۔ نصف حسین میرزا اور

تم اور حماد نصف نہیں۔ مفلحوں کا دار حیات خیالات پر ہے، مگر انہیں خیالات سے ان کا حسن طبیعت معلوم ہو جاتا ہے۔ والسلام خیر ختام۔

دوشنبہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء وقت صبح۔ (غالب)

(۱۰۲)

یوسف میرزا!

کیوں کرتے تھے کہ لکھنؤ کے حیراباپ امر گیا اور اگر لکھنؤ تو پھر آگے کیا لکھنؤ کی اب کیا کرو؟ مگر میر؟ یہ ایک شیعوں فرسودہ اہلئے روزگار کا ہے۔ عزیمت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ میر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تھوڑا تھوڑا۔ مگر تھوڑا ہے گا۔ ملاح اس امر میں نہیں جانی جاتی۔ وہ اکوٹل نہیں دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے جیسا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں تو نہیں کہوں گا یوسف میرزا کو۔

تمہاری دادی گھنٹی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جو افراد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ ذقید حیات رہی ذقید فریک۔ ہاں صاحب وہ لکھتے ہیں کہ جنس کا رد پیل گیا تھا۔ وہ جیسے دیکھتے ہیں کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ جو مجرم ہو کر چودہ برس کو مقید ہوا اس کا جنس کیوں کر ملے گا اور کسی درخواست سے ملے گا؟ رسید کس سے لی جائے گی؟

مصطفیٰ خاں کی رہائی کا حکم ہوا مگر جنس ضبط۔ ہر چند اس پڈشل سے کچھ حاصل نہیں لیکن بہت عجیب بات ہے تمہارے خیال میں جو کچھ آئے وہ مجھ کو لکھو۔ دوسرا امر یعنی تبدیل مذہب عیارا بائبل اعلیٰ کا تلام بھی مرتب نہ ہو گا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ حضرت چالاک اور خن ساز اور ظریف تھے۔ سوچے ہوں کے گمان دلوں میں اپنا کام لگا لیا اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلے ہے۔ اگر یہ بھی تھا تو ان کا گمان غلط تھا۔ اس طرح رہائی ممکن نہیں۔ قصہ مختصر تمہاری دادی کا خط جو تمہارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا وہ نہیں نے تمہارے ماموں کو بھیج دیا۔ ان کی جاہل دیوانگراشت کا نتیجہ ہو گیا ہے اگر ان کے بڑے بھائی کے بارے میں ان کو چھوڑیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔

منظر میرزا کو دعا پینچے۔ تمہارا خط جواب طلب نہ تھا۔ تمہارے بچا کا آغا ز اچھا ہے خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو۔ ان کا مقدمہ دیکھ کر تمہاری چھو بھی کا اور تمہارا سرا انجام

دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ ہو گا کیا؟ اگر چاہا دین میں بھی گنہیں تو قرعہ در دام دام میں گئے۔
 راز حق حقیقی فہم و دلواری کے روشنی کا کام چلے۔ جناب میر قمر خان علی صاحب کو میر اسلام نیاز اور میر
 کاظم علی کو دعا۔

مرقومہ شنبہ ۲۷ شوال (۱۲۷۶ھ) ۱۹ مئی سال مال (۱۸۶۰ع)

غالب

نواب میر غلام بابا خاں

(۱۰۳)

جناب سید صاحب قبلہ:

بعد بندگی عرض کرتا ہوں کہ عنایت نامہ آپ کا پہنچا۔ آپ جو فرماتے ہیں کہ تو اپنی
 خیریت کبھی کبھی لکھا کر آگے اپنی ملاقات ہائی تھی کہ لینے لینے کچھ لکھتا تھا اب وہ ملاقات بھی راکھ
 ہو گئی۔ ہاتھ میں رشتہ پیدا ہو گیا، بیٹائی ضعیف ہو گئی۔ حصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں۔ عزیزوں
 اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آگئے تو نہیں مطلب کہتا میاں وہ لکھتے گئے۔ یہ حسن اتفاق
 ہے کہ کل آپ کا خط آیا آج ہی ایک دوست میرا آگیا کہ یہ چند سطریں لکھوا دیں اور یہ آپ کبھی
 دفرمائیں کہ خشی میاں داوخواں سے مجھے قطع محبت ہو گیا ہے۔ خشی صاحب کی محبت اور ان کے توسط
 سے آپ کی محبت دل و جان میں اس قدر ساگنی ہے، جیسا اہل اسلام میں ملکہ ایمان کا۔ بس ایسی
 محبت کا سقوط ہونا کبھی ممکن نہیں۔ امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص، ہمدگر کی شرح کے بعد جھوم
 غم ہائے نہانی کا ذکر کیا کروں؟ جیسا ابرسیا ہ چھا جاتا ہے یا لڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے
 ۔ سیف الحق خشی میاں داوخواں کو سلام کہیے گا اور یہ خط پڑھا دیجئے گا۔

نجات کا طالب غالب

روز چہار شنبہ ۲۶ اپریل ۱۸۶۸ع

نواب ابراہیم علی خاں وفا

(۱۰۴)

دلی نعت کو غالب کی ہندگی!

بہسب ضعف پیری کے خدمت گزاری میں درنگ واقع ہو جائے تو معاف رہوں، کبھی قصور نہ رہوں گا، انشاء اللہ العظیم۔ دو غزلوں میں سے ایک غزل بعد اہم صلاح پہنچتی ہے دوسری غزل ہفتہ آئندہ میں پہنچ جائے گی۔ ضعف اعضاء اور دوام مرض سے علاوہ اشتغال حواس کا کیا حال لکھوں۔ دو تین دن ہونے کے قبلہ کعب میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آرزوہ شخص کی دو غزلیں اصلاحی پہنچیں۔ دیکھئے اس سہو کو کس کی غزلیں کس کو پہنچیں۔ جزا اس میں ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں آتا کہ آرزوہ کا نام کیا ہے اور وہ کون ہے اور کہاں کا ہے؟ شاید اس بندہ خدا کو حضرت کی غزلیں کبھی ہوں گی۔ خدا کرے وہ بزرگوار میر صاحب کی غزلیں میر صاحب کی طرح میرے پاس پہنچ دے تو میر صاحب کی خدمت میں پہنچا دوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ان غزلوں کو 'جو اب آئی ہیں' دیکھوں گا۔ یہ اکہتر برس کی عمر کی غزلیں ہے۔ آپ میر صاحب قبلہ کو خط پڑھوا دیجئے گا۔

لفظ کرم کا غالب، غالب

۱۴۰ اکتوبر ۱۸۶۶ ع

حکیم سیّد احمد حسن مودودی

(۱۰۵)

سید صاحب قبلہ

مناہیت نامہ مع قصیدہ پہنچا۔ پس ویش ایک راحت نامہ پیر و مرشد سید ابراہیم علی خاں صاحب بہادر اور ایک عطرقت نامہ قبلہ کعب سید عالم علی خاں بہادر کا پہنچا۔ نہیں علی کا غلام ہوں اور اولاد علی کا خاندان لیکن بوڑھا اور ناخواند اور مستلوب الحواس اور بے سرو سامان خدمت نبی اللہ نے میں غدر کروں تو گنہگار۔ درنگ و توقف کامنہا کھنچیں۔ لا ینکف اللہ نفساً ولا وجہاً۔

خداوند نعمت کیا تم دنی کو آباد اور قلم کو معذور اور سلطنت کو بدستور رکھے ہوئے ہو؟ جو حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن ابی مہر مولا نا فقیر اللہ بن علیہ الرحمۃ کا حال پر چنتے ہو؟

اسی دفتر راگاز خورد گاؤ را قصاب برد و قصاب در راه مرد

بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جہاز و جہیز دی۔ کاغذ کا پتہ نہ سونے کا تار، پشین کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی و مہر اللہ علیہ کا مقبرہ اُچڑ گیا۔ ایک اجھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر کوئی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی چاہتا ہو گا کہ کہاں ہیں۔ اُن کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا؟ کچھ حیرات بھی تھی۔ اب جب وہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں؟ کیا کروں؟ کہیں سے پیدا ہوا حاصل نہ ہو سکے گا۔

سید صاحب قبلہ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟ اگر یہی مرضی ہے تو اتنا خوف و اہل تکلف محض ہے۔ فقیر بے سوال ہوں اگر کچھ بھیج دیں گے دود نہ کروں گا۔ کم و بیش پر نظر نہ کریں، جتنے کا چاہیں نوٹ خط میں لپیٹ کر بھیج دیں۔ والسلام

(روز شنبہ یکم ستمبر ۱۸۶۳ ع)

از اسد اللہ

(۱۰۶)

پیر درمہ شذ

آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ دوشہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ میں بوخارہ پہنچا۔ اس وقت تھل ہو گئے۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لینے لینے دیکھا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب خدا نکہ سے اچھی طرح سوچتے نہ ہات سے اچھی طرح کھٹا جائے۔ کہتے ہیں شاہ شرف علی بوقلمنہ کو بہسب کیر بن کے خدا تعالیٰ نے فرض اور پیر پیر نے ملت معاف کر دی تھی۔ نہیں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ مطلقاً شوق کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔

زیادہ حد ادب

راقم اسد اللہ خاں غالب

۸۔ اپریل ۱۸۶۶ ع

تفضل حسین خاں (۱۰۷)

کیوں صاحب

یہ چچا جتھیا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی بھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور نہیں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈالتے۔ میرا کلام 'خرید آٹھ دس روپیہ کی مسودہ بھی نہیں نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک دے ہے۔ مجھ کو مستعار دو۔ نہیں اس کو دیکھ لوں پھر تم کو واپس بھیج دوں گا۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا' دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو میرا اعتبار نہیں یا یہ کہ مجھ کو آزاد دینا اور ستانا بدل مطلوب ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آوی کو دے دو۔ باللہ واللہ اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم نہ مانو اور کتاب حاصل نہ کرو تو تم کو آفریں۔

غالب

میاں داد خاں سیاح

(۱۰۸)

سعادت و اقبال نشان 'منشی میاں داد خاں سے نہیں بہت شرمندہ ہوں کہ ان کے خطوط کا جواب نہیں لکھا۔ غزلوں کے مسودے تم ہو گئے۔ اس شرمندگی سے پانچ لگا رہا ہوں۔ اب یہ سطر میں جو لکھتا ہوں اس خط کے جواب میں ہیں جو پانچویں سے آیا ہے۔

برائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی نہیں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور 'چراغ دہلی' اس کا نام رکھا ہے۔ وہ فارسی و بھوجان میں موجود ہے اس کو دیکھنا۔

اشرف حسین خاں صاحب میرے دوست ہیں۔ فتنہ و فساد کے زمانے سے بہت پہلے ان کا خط اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے۔ تم ان کو میرا سلام کہنا اور نہیں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگزشت لکھی ہے اسی طرح آئندہ بھی لکھتے رہو گے۔ نہیں میرا سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں۔

اگر یہ دل نہ غلط ہرچہ از نظر گزرد
 نہ رہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد
 خیر اگر سیر و سیاحت بسر نہیں نہ سہی ”ذکر اہیش نصف اہیش“ پر قاعدت کی۔ یہاں
 داؤد خاں سیاح کی سرگزشت میر و سفر ہی تھی۔

غزل تمہاری رہنے دیتا ہوں اس کے دیکھنے کی ابھی فرصت نہیں ہے۔ جیسا تم نے وعدہ کیا
 ہے، جب اور غزل لیں گے ان کے ساتھ اس کو بھی دیکھ لوں گا، بلکہ احتیاطاً مقتضی اس کی ہے کہ ان
 غزلوں کے ساتھ اس کو بھی لکھ بھیجوں۔

تا تو اتنی زور پر ہے، بڑا چاپے نے نکلا کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کالی، مگر اس جانی، مگرانی۔
 رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر، ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دورا زور پیش ہے۔ زاورا، مو جو نہیں۔ خالی
 ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر تپندہ سیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز بندس ہوئی تو ستر مقرر ہے اور پاد یہ زادیہ ہے،
 دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ پائے کسی کا الیہ، چھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
 مر کے بھی نکلن نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اللہ! اللہ! اللہ!

صبح دو شنبہ ۳ دسمبر ۱۸۶۰ ع
 نجات کا غالب غالب

(۱۰۹)

آجے بیٹھے مولانا سیاح الاسلام علیکم۔ حراج مبارک۔ سورت کا پہنچنا۔ ہر صورت
 مبارک ہو۔ بھائی میرا دل بہت خوش ہوا کہ تم اپنے وطن پہنچے، لیکن تم کو کچھ نہیں کہاں؟ خدا جانے کے
 لئے یا کے صبیحہ ظہر و گے اور پھر سیاحت کو نکلے گے۔ جی میں کہو گے آداب دکن کی سیر کریں۔ حیدر
 آباد اور تھک آباد دونوں شہر اچھے ہیں، ان کو دیکھیں۔

میرزا حسین الدین حسین خاں اور میرزا احمد حسین خاں یہ دونوں بیٹے ہیں نواب قدرت
 اللہ بیگ خاں کے، اور قدرت اللہ بیگ خاں ابن عم تھے نواب خدا بخش خاں کے اور حسین الدین
 حسین خاں کی بہن منسوب ہے بھائی ضیاء اللہ بن خاں سے۔

یہاں کوئی امر نیا واقع نہیں ہوا وہی حالات و اطوار ہیں جو کچھ گئے ہو۔ مسجد جامع کے باب میں کچھ پُرستشیں لاہور سے آئی تھیں یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ وائزر کا حکم آنے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ بنور بدستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔ والسلام مع الاکرام۔

صبح شنبہ ذیقعدہ (۱۲۷۸ھ) کو مئی (۱۸۶۲ء) غالب

(۱۱۰)

فشی صاحب سعادت و اقبال نشان

شکوہ تمہارا میرے سر آنکھوں پر نہ گھر کوئی تھا تمہارا جواب طلب نہ تھا۔ اشعار کی اصلاح سے نہیں نے ہاتھ اٹھایا۔ کیا کروں؟ ایک برس سے عوارض فساد بخون میں مبتلا ہوں۔ دن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چٹائیاں ہو گیا ہے۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھاتے وقت پٹنگ پر سے اتر بیٹھتا ہوں۔ کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر پھر بچ رہتا ہوں۔ حاجتی پٹنگ کے پاس لگی رہتی ہے آخر کڑی شب کیا جاتا ہے نیت اللہ جانا ایک نصیبت ہے۔ تفت چکی سکی گھر کی قدم جانا پھر آنا کیا ایسا آسان ہے۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی۔ اب نجات چاہتا ہوں۔ بہت جیسا کہاں تک جیوں گا۔ (اب تم دوسرے صفحہ کو پڑھو) جناب تو اب سید غلام بابا خاں صاحب کی خدمت میں سلام کہنا اور الادب فرزند کی مبارک باد دینا اور یہ قطعہ تاریخ نذر کرنا:

میر بابا یافت فرزندے کہ ماہ چار دہ

بر فراز لوح گردوں گردہ قنابل دوست

فرخی بینی و بانی بہرہ از ناز و طرب

از سر ناز و طرب "فرزند قرخ قال" دوست

۱۲۸۰ھ۔ "ناز" کے لون کے "پچاس" "لوڑ" طرب" کی طوے کے "نو" "فرخ قال"

پر بڑھانے ہوں گے۔

غالب

پنجشنبہ ۱۶۔ اگست ۱۸۶۲ء

(۱۱۱)

سعادت و اقبال نشان 'سیف الحق' میاں داوواں کو قنبر احمد غالب کی دعا پہنچے۔
خط میں آپ نے بہت سے مطالب کئے۔ مگر تیس کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی۔ یہ
ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے اس میں وہی 'لظائف فیہی' جس کو میں نے اپنے
مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ دعا ہے کہ تم ان تیس رسالوں کو اس کے مطابق
صحیح کرو اور اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا ہے تو ان سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کرو
اور وہ نسخہ ان کی غذا کر دو۔

صاحب نے اپنے صرف در سے "لظائف فیہی" کی جلدیں نہیں بھیجا تھیں۔
مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔ میں نے مول لیس تیس تم کو دلوادیں۔ میں بھائی خیاہ
الدین نے لیس مدرس مصطفیٰ خاں صاحب نے لیس۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں۔
دیکھو سیک الحق اسعدی کا قول کیا سچا ہے:

اگر دنیا نہ باشد درد مندم وگر باشد یہ مہرش پائے بندم
بلائے زریں جہاں آشوب تر نیست کرد خج خاطر است اورست و در نیست
جہاں دولت نہیں وہاں مصیبت ہے، جہاں دولت ہے وہاں خصومت ہے۔ میں تو میر
غلام بابا خاں کا دوست ہوں، ان کی فتح کی دعا مانگتا ہوں۔ آپ اتنی مہربانی کریں کہ یہ حالات جو
واقع ہوا کریں وہ مجھے لکھنا کریں۔

غریبہ کی ہندی "نغزہ" ہے ناری میں فریلہ بولتے ہیں۔

پہچم شعبان ۱۲۸۱ھ مطابق ۳۔ جنوری ۱۸۶۵ع نجات کا طالب غالب

(۱۱۲)

غشی صاحب 'سعادت و اقبال نشان' سیف الحق میاں داوواں کو قنبر احمد غالب کا سلام۔
کل ۲۰۔ شب ۲۰۔ فردری صبح کے وقت چہ پارسل چھتیس 'ورزش کلونیائی' کے 'نواب میر غلام بابا کی
خدمت میں ارسال کئے۔ کل ہی شام کے وقت آپ کا عنایت : پہنچا حال معلوم ہوا۔ خیر اب
آوردہ بھیجوں گا۔

صاحب: یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بیچے؟ میں نہ کتاب فروش نہ دلال! یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی اور تم نے بُرا کیا۔ حضرت سولہ جلدیں "لٹاکف" نہیں کی بھیج کر اس کے پان سات دن کے بعد میں "نامہ غالب" کا پارسل ارسال کیا ہے۔ "لٹاکف" کی رسید تم نے بھیج دی یقین ہے کہ "نامہ غالب" کا پارسل بھی پہنچ جائے گا، تمہارا نہیں۔ تو اب صاحب کی خدمت میں میرا سلام اور اشتیاقی ملاقات عرض کرنا۔

۲۱۔ فروری ۱۸۶۶ء ع محبت کا طالب: غالب

(۱۱۳)

مولانا سیف الحق:

اب تو کوئی خط تمہارا نوٹ اور ہندوی اور ٹکٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ بھلا یہ تو فرمایا ہے کہ یہڑ حائی روپے کس جاہت کے اور کس جنس کی قیمت کے ہیں؟ اچھے پانچ روپے پر نہیں بے ضرر ہوا تھا۔ یہڑ حائی اور طرہ ہوئے۔ بہر حال ان کا حال لکھو کہ کیسے ہیں اور کاہے کے ہیں؟ اس وقت کے جواب جلد لکھو۔ نوٹیاں بعد عید بھیجی جائیں گی۔

۲۳۔ اپریل ۱۸۶۶ء ع محبت کا طالب: غالب

(۱۱۴)

صاحب:

میرا سلام۔ تمہارا خط پہنچا۔ دونوں غزلیں دیکھیں۔ خوش ہوا۔ فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں اور فن شعر میں اگر اس شیوے کی رعایت کی جائے تو شاگرد باقص رہ جاتا ہے۔ یاد کرو، کبھی کوئی غزل تمہاری اس طرح کی نہیں ہوئی کہ جس میں اصلاح نہ ہوئی ہو، خصوصاً زمرہ اردو میں۔ دونوں غزلیں لفظ اور معنی بے عیب ہیں، کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔ آفرین اور صد ہزار آفرین۔

میر غلام بابا صاحب واقعی ایسے ہی ہیں، جہاں تم کہتے ہو، سیاحت میں دس ہزار شخص

تمھاری نظر سے گزرا ہو گا۔ اس گردہ کثیر میں جو تم ایک آدمی کے مداح ہوتو بھٹک دو شخص ہزاروں میں ایک ہے۔ لارپ نیب۔ کیا فرمائیں کروں اور کیا تم سے ملناؤں؟ وہاں کوئی چیز ہے کہ یہاں نہیں۔ آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں انگور سے کم عزیز نہیں لیکن بہت اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت؟ والدے کا آم یہاں بیج ندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہو گا۔ سورت سے دلی آم بیجے محض تکلف ہے۔ روپے کے آم اور چار روپے محصول ڈاک اور پھر سو سے شاید دس پہنچیں۔ میرے سر کی قسم کبھی ایسا ارادہ نہ کرتا۔ یہاں دوسری آم انواع و اقسام کے بہت پاکیزہ لذیذ اور خوشبو افراط سے ہیں۔ بیج ندی آم بھی بہت ہیں۔ رام پور سے ثواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر ہیمیل اور مخان بیچتے رہتے ہیں۔ اے لو! آج بریلی سے ایک بھنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکے ہر ٹوکے میں سو آم۔ کلو دارونہ نے میرے سامنے دو ٹوکے کھولے دوسو میں تراسی آم اچھے لکھے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوئے۔ اوائل جون ماہ حال میں ایک ہفتہ میں برس کہ بھراب دی آگ برس رہی ہے اور لو پھل رہی ہے۔

(غالب)

۷۔ جون ۱۸۶۶ء

(۱۱۵)

برائی سیف الحق تمھارا خط پہنچا۔ قاضی صاحب بزدلہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی عیب اپنے پران کے خطاب کی پانچواں سے غذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سب ملال کا ٹکا ہر نہیں تو نہیں کیا کروں؟ تم نہ اندھاؤ کس واسطے کہ اگر میں نہ ہوں تو اس نے کچ کہا اور اگر نہیں اچھا ہوں اور اس نے نہ کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو:

غالب نہا نہ بان جو دشمن نہا کہیں

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

صاحب اس بڑے حاسپے میں تصویر کے پردے میں کہاں کچا کچا بھروں؟ گوشہ نظیں

آدی عکس کی تصویر اجارے والے کو کہاں؟ صوفیوں؟ دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں بھی ہوئی ہے اگر ہاتھ آ جائے گی تو دور قیجے دوں گا۔

اسی دن وہ نہیں نے نواب صاحب کو کسی سے ایک بات لکھی تھی اور ساتھ ساتھ یہ بھی نہیں بھرا ہوں گا کیا سنوں گا؟ بڑا صاحبوں؟ ناچ کیا لکھوں گا؟ نڈا چہ ماشے آنا کھانا کیا کھاؤں گا؟ یہی سورت میں ناگریزی شرا میں ہوتی ہیں اگر وہاں آنا اور شریک محفل ہونا تو پنی لیتا۔

۵۔ ستمبر ۱۸۶۶ء نجابت کا طالب نالاب

(۱۱۶)

نقی صاحب شفیق بد دل مہربان عزیز تر از جان سیف الحق میاں دلو خاں کو فقیر غائب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ ہر سوں نواب صاحب کا خط آیا۔ صاحب فریبوں کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے ”لطائف نجیبی“ کی چند جلدیں ساتھ دوپے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوا لیں پھر دودھ پے کے نکلت بھیج کر فریبیاں منگوا لیں۔ میں نے تمہارے پیسے ہوئے دوپوں کی فریبیاں خرید کر تم کو بھیج دیں۔ چاہے تم پہنچو چاہے چھو نے صاحب کی نذر کرو۔

قصص جو نہیں نے ”سیف الحق“ کا خطاب دیا ہے اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے تم میرے ہاتھ ہو تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ ”لطائف نجیبی“ نے ادا کی دجیاں اڑا دیں۔

ایک نئی بات سنو۔ محمد میرزا خان میرے سببی بھائی کا نواسا ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے مسلیٰ یہ ”اشرف الاخبار“۔ اس کا ایک الفاظ کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمہارا ایک امتزاج قتل کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔ ہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ چھو نے صاحب کی نظر سے بھی گزر جائے اور اس سرکار میں یہ اخبار خرید کیا جائے اور تم ان کی طرف سے حکم خریداری ابتداء جنوری ۱۸۶۷ء سے پتہ محمد میرزا خان لکھنؤ اور وہ خط اس پتے سے دلی روانہ کرو جو ان کے اخبار کے آفس میں لکھا ہے۔

حیران ہوں کہ چھو نے صاحب کے خط کا کیا جواب لکھوں۔ انہوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ اپنے کو چھوٹا اور مجھ کو بزرگ لکھا۔ سید تو سب مسلمانوں کے بزرگ ہوتے ہیں۔ میں تو مسلمانوں میں بھی ایک ذلیل، علیل، فقیر، حقیر آدمی ہوں۔ یہ ان کی بزرگی ان کی خوبی ان کی مہربانی ہے۔ حق تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور ان مقدمات میں من کل الوجوه ان کو فتح و ظفر نصیب

ہو۔ میرا سلام کہتا اور یہ عبارت پڑھا دیتا۔

ہاں صاحب! اور بھان بھائی میرزا حسین الدین حسین خاں بہادر کو میرا سلام کہتا اور کہتا کہ بھائی میرا بیوی دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ پہلے بر خورد اور شہاب الدین خاں صاحب سے پوچھو وہ اجازت دے تو فوراً ریل میں چل کر تے چلے آؤ۔ غلط

دیکھو اور کا طالب خاں صاحب

سرخسہ کے۔ شوال ۱۲۸۳ھ

مطابق ۱۲ فروردی ۱۸۶۷ء

میر حبیب اللہ کا

(۱۱۷)

میرے مشفق! میرے شفیق! مجھ سے بچ بچ کے ماننے والے! مجھ سے نہ رے کو اچھا جاننے والے میرے محبت! میرے محبوب! تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے نا تو ان قضاہ اب علم جان ہوں۔ آگے بہرا قضاہ اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سڑک کا وہ آدرو ہے رعد و ضعف بھر۔ جہاں چار سطرین نکلیں! انگلیاں نیچھی ہو گئیں! حرف نہ بولنے سے رو گئے۔ اکہتر برس جیہ! بہت جیہ! اب ذمہ کی برسوں کی نہیں! مسنوں اور دونوں کی ہے۔

پہلا خط تمہارا پہنچا! اس سے تمہارا مریض ہونا معلوم ہوا۔ متواتر دوسرا خط مع غزل آیا۔ غزل کو دیکھا۔ سب شعر اچھے اور لطیف۔ حافظے کا یہ حال ہے کہ غزل کی زمین یاد نہیں آتا کیا وہ ہے کہ ایک لفظ میں کوئی شعر بدلا گیا تھا۔ غرض کہ وہ غزل بعد مشاہدہ تم کو بھیجی گئی اور لکھا گیا کہ نوید حصول صحت جلد بھیجو۔

کل ایک خط رجسٹری دار آیا! گویا ستارہ و نہالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ بارے کھولا اور دیکھا۔ خط نوید دفع مرض و حصول صحت سے خالی اور شکوہ ہائے ہے جاے لبریز۔

صاحب! میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہوؤ وہیں رہ جائے تو وہ جائے نہ نہ توئی کے ڈاک خانہ میں پہنچ کر کیا حال ہے! جو مجھ تک نہ پہنچے۔ وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں کو اختیار ہے کہ کتاب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔ آپ مرزا صاحب کا تذکرہ مانتے ہیں؟ اس کا حال یہ ہے کہ قدر سے پہلے چھپا اور خرد میں تاراج ہو گیا۔ اب ایک مجلد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔

بس اب مجھ سے کھانا باقی ہے کہ اس خط کی رسید اور اپنی خیر و عافیت جلد لکھو۔

صبح جمعہ ۲۵۔ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ع جواب کا خطاب غالب

چوہدری عبدالغفور سرور

(۱۱۸)

میرے مشفق چوہدری عبدالغفور صاحب اپنے خط اور قصیدہ بیچنے کا مجھ کو شکر گزار اور قصیدہ سابق کی اب تک اصلاح نہ پانے سے شرمسار تصور فرمائیں اور ان دونوں قصیدوں کے باہم پہنچنے کا انتظار کریں۔

نویں وصل ویم سے وہ ستارہ شمس

نکروہ ژرف نگاہے مگر وہ اختر من

حقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نصاب جامع و ارجح الجمع بہزم وحدت کے فردز مدح مستغرق مشاہدہ شاہ ذات حضرت صاحب عالم قدسی صفات کی طرف ہے اور یہ شعر افتتاح کلام ہے۔

پہلے کچھ باتیں کہ بادی انگہ میں خارج از بحث معلوم ہوں گی، لکھی جاتی ہیں۔ نہیں پانچ برس کا تھا کہ میرا پیرا خواہی کہ تھا کہ چار برس اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر خواہ احمد بخش خاں اُس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ نہیں نے سرکار انگریزی میں یہ زمین ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر رینڈ ٹنٹ دہلی اور اسٹریٹنگ صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ کلکتہ متعلق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رینڈ ٹنٹ معزول ہو گئے سکریٹری گورنمنٹ برک ناگاہر گئے۔

بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پیاس روپے بیس مقرر کیا، ان کے دلی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔

واحد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے یہ صلہ چ گشتی پانسو روپے سال مقرر ہوئے وہ

بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے یعنی اگر چہ آپ تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور چاہی سلطنت
 دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجھ کو دلی دے کر نکلی۔ ایسے
 طالع مزاجی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب نہیں جودالی دکن کی طرف رجوع کروں۔
 یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس
 کی ضائع ہو جائے گی اور دلی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور اسیلئے اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک
 میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے بل پھر جائیں گے۔ اسے خداوند بندہ پروڈیہ سب باتیں
 واقعی اور واقعی ہیں۔

اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں قصد تو کر سکتا ہوں مقام کون کرے گا؟
 سوائے ایک ملک کے کہ وہ پاس بھیجن برس کی مشق کا نتیجہ ہے کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو
 سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر نہیں
 نے کیوں کر لکھی تھی اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے؟ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے
 ہے:

عالم ہمہ اقسام ما وارو و ما یچ

پایان عمر ہے۔ دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو رو پے دام پور کئے ساتھ رو پے
 ٹھن کے روئی کھانے کو بہت ہیں۔ گھٹی اور مرزائی امور عام میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و
 ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادہ و جیل ہیں۔ دیکھو فنی نمی کش مجھ سے عمر میں
 چھوٹے تھے ماگزینہ میں گزر گئے۔ مجھ میں قصیدے کے لکھنے کی قوت کہاں؟ اگر ارادہ کروں تو
 فرصت کہاں؟ قصیدہ لکھوں آپ کے پاس بھیجوں آپ دکن کو بھیجیں۔ متوسط کب پیش کرنے کا
 موقع پائے؟ پیش کئے پر کیا پیش آئے؟ ان مراحل کے طے ہونے تک نہیں کہیں کر جیوں گا؟
 اللہ و اتالیبہ الرحمن۔ لا الہ الا اللہ ولا معبود الا اللہ ولا مسجود الا اللہ کان اللہ ولم یکن شیء واللہ الا ان
 کما کان۔

(غائب)

ع ۱۸۶۰

تشریحات

خط ۱:

- حوالہ ۱۔ امین الدین احمد خاں اور ضیا مالدین احمد خاں بزرگ خاں۔
 ۲۔ شرف الدولہ قاسم جان اور اس کے بیٹے فیض اللہ بیگ کا خطاب: فخر الدولہ نواب
 امین الدین کے والد نواب احمد بخش کا خطاب۔
 ۳۔ نواب الہی بخش معروف (برادر نواب احمد بخش) کی دختر۔
 ۴۔ زمین العابدین عارف کے لڑکے باقر علی خاں و حسین علی خاں، جنہیں عارف کی
 وفات کے بعد غالب نے پالا۔
 ۵۔ غالب کے بھائی مرزا یوسف کی بیٹی مزینہ انسا جو غلام فخر الدین خاں (بن علی بخش
 خاں بن الہی بخش معروف) سے بیاہی گئی۔
 ۶۔ مرزا اعجاز الدین خاں علاقائی امین نواب امین الدین احمد خاں۔

خط ۳:

- حوالہ ۱۔ علاقائی کا چھوٹا بھائی۔ ۲۔ نواب امین الدین احمد خاں۔

خط ۶:

- حوالہ ۱۔ ضیا مالدین احمد خاں بزرگ۔ ۲۔ یعنی پیدا ہوا۔
 ۳۔ یعنی شادی ہوئی بیڑی یعنی بیوی۔
 ۴۔ عارف کے بیٹے باقر علی خاں و حسین علی خاں۔ ۵۔ یعنی موت۔

خط ۷:

- حوالہ ۱۔ گادہ شیک (ہندی) بمعنی آ رہ۔ بیلوں کو ہانکنے کی لکڑی جس کے سرے پر لوہے کی سوئی
 ہوتی ہے۔ ۲۔ ریاست دہلی۔

خط ۹:

- حوالہ ۱۔ نواب نہایت علی والی سمجھ کا چھوٹا بیٹا۔ حوتی ۱۸۶۲ء۔
 ۲۔ ابن شیخ نظام الدین ابن خولجہ فخر عالم۔ ۳۔ نواب غلام محی الدین۔

خط ۱۰:

- حوالہ ۱۔ وہ لوگ جنہیں انقلاب ۱۸۵۷ء میں حصہ لینے کی پاداش میں جلا وطن کیا گیا۔
 ۲۔ نواب تنقش حسین خاں "انقلاب ۱۸۵۷ء میں شریک ہوئے۔ کہ منظر میں
 صبر کی حالت میں فوت ہوئے۔
 ۳۔ کلیات نظم فارسی۔ ۴۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر۔
 ۵۔ شہاب الدین خاں ثاقب (مشہور شیخ طریقت سے اشتراک اسم کی
 بنا پر انہیں "سہروردی" لکھا ہے)۔

خط ۱۱:

- حوالہ ۱۔ نواب النبی بخش خاں معروف "غالب کے فر۔
 ۲۔ یعنی مکتوب الیہ علاؤ الدین ملائی۔ ۳۔ غالب۔
 ۳۔ غالب حافظ کا یہ نام نہ شعر ملائی نے اپنے اتالیق حمزہ خاں کے کہنے پر غالب کو لکھا
 ہوگا:

چوں بحر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
 رندی و سیہ مستی در عہد شباب اولی

خط ۱۲:

- حوالہ ۱۔ گزرگاہ۔ ۲۔ چڑیلین

خط ۱۳:

- حوالہ ۱۔ ایسی طوالت جو دیکھ کر دے۔

خط ۱۶:

- حوالہ ۱۔ نواب کلب علی خاں۔

خط ۱۸:

حوالہ ۱۔ قاطع برہان۔

خط ۳۱:

حوالہ ۱۔ بابو جانی ہاگل لال رند راجہ بھرت پور کے وکیل۔

خط ۴۵:

حوالہ ۱۔ ششی مہی بخش حقیر۔

خط ۴۷:

حوالہ ۱۔ بہنرارد شواری۔

خط ۳۲:

حوالہ ۱۔ ”دھنیو“ جو پابھتام ششی شید زائن آرام زیر طبع تھی۔

خط ۵۵:

حوالہ ۱۔ راجہ جیت سنگھ سابق والی بنارس کا فرزند۔

خط ۵۸:

حوالہ ۱۔ دھنیو۔

خط ۶۶:

حوالہ ۱۔ ساتھ کھیلنے والا۔

خط ۶۹:

حوالہ ۱۔ چاندنی چوک۔ ۲۔ کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ)۔

خط ۷۰:

حوالہ ۱۔ حالی نے اسی کزل سے متعلق غالب کا یہ لطیف بیان کیا ہے کہ غدر کے بعد میرزا

سامنے آئے تو اس نے پوچھا: بول غم مسلمان؟ میرزا نے کہا:

آدھا۔ کزل نے پوچھا: اس کا مطلب؟ میرزا نے کہا: شراب پیتا ہوں سو ریشم کھاتا

(بادشاہ غالب)

خط ۶۷:

- حوالہ ۱۔ ڈاکٹرن ڈیوٹی یا حصول چوگی۔
۲۔ ایک درس گاؤ قائم کردہ مفتی صدرالدین آزاد۔

خط ۸۴:

- حوالہ ۱۔ نواب احمد بخش والی فیروز پور حمر کا لوہار۔

خط ۹۲:

- حوالہ ۱۔ کتاب ”دستیو“ کا پارسل۔

خط ۹۳:

- حوالہ ۱۔ یعنی شراب۔

خط ۹۴:

- حوالہ ۱۔ خان بہادر سید محمد خاں پنجبر کے ماسوں۔

خط ۱۰۱:

- حوالہ ۱۔ یعنی رام پر سے۔ ۲۔ واجد علی شاہ۔

خط ۱۰۲:

- حوالہ ۱۔ میرزا محمد نصیر لکھنؤ میں رہتے تھے۔

خط ۱۰۸:

- حوالہ ۱۔ خاتونی ہند محمد ابراہیم لائق کاشغر ہے۔

خط ۱۱۷:

- حوالہ ۱۔ سفر کا قلم۔ ۲۔ میرزا قادر بخش صاحب کاتھ کرہ ”گلستان سخن“۔

خط ۱۱۸:

- حوالہ ۱۔ شہزادہ فتح الملک بہادر علی میرزا نقوی (موتی ۱۸۵۶ء)۔

”انتخابِ خطوط“ میں غالب کے مکتوب الیہم کا مختصر تعارف

نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو:

نواب احمد بخش خاں کے بیٹے تھے۔ نواب الہی بخش خاں معروف نواب احمد بخش کے بھائی تھے جو غالب کے خسر ہوئے۔ نواب امین الدین احمد کے دوسرے بیٹے ضیاء الدین احمد خاں (غیر درخشاں تخلص) تھے۔ نواب احمد بخش ۱۸۴۷ء میں فوت ہوئے۔ نواب امین الدین احمد ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بڑے صاحبزادے اور غالب کے شاگرد نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی والی ریاست لوہارو ہوئے۔ غالب نے علائی کو اپنا خلیفہ جانی بنایا تھا۔ علائی ۱۸۸۳ء میں فوت ہوئے۔ امین الدین احمد خاں کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں کو جو اردو میں غیر اور فارسی میں درخشاں تخلص کرتے تھے غالب نے خلیفہ ازل بنایا ہوا تھا۔ وہ ۱۸۸۵ء میں فوت ہوئے۔

علاء الدین احمد خاں علائی دہلوی (والی لوہارو) :

نواب امین الدین احمد خاں (۱۸۱۳-۱۸۶۹ء) کے فرزند تھے۔ ولادت دہلی ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء۔ ان کی تعلیم غالب کی نگرانی میں ہوئی جو علائی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ فارسی ترکی اور عربی کی استعداد عالمائے تھی۔ اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ۳۶ سال کی عمر میں والد کی حیات میں ہی لوہارو کی گدی میں بٹھا دیئے گئے۔ علائی کی وفات ۱۳ اکتوبر ۱۸۸۳ء ہوئی۔

میرزا اشہاب الدین احمد طاہر قتب دہلوی:

نواب ضیاء الدین احمد خاں غیر درخشاں کے بڑے صاحبزادے ۱۸۳۰ء میں پیدا

ہوئے۔ والد کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ اپنی قابلیت اور لیاقت کی بدولت جلد ہی ممتاز ہو گئے۔ انگریزی حکومت نے انھیں دہلی میں آفری بی بسٹریٹ مقرر کیا۔ غالب کی وفات کے دو ماہ بعد ۱۱۹ پرل ۱۸۶۹ء کو فوت ہو گئے۔ خاقان مخلص غالب کا دیا ہوا ہے جو شہاب کی مناسبت سے ہے۔

میرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی:

پیدائش حیدر آباد (دکن) میں ہوئی۔ والد (مرزا عالم علی بیگ) کی ملازمت کے اختتام پر بچپن میں دہلی آ گئے تھے اور پہلی نشوونما اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ ریاست انور میں خدمت و کالت پر مامور ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر حیدر آباد چلے گئے اور صیغہ تعلیمات میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ نواب غلام الملک (سید حسین بکراوی) کی سرپرستی میں ایک رسالہ ”مغزن الفوائد“ جاری کیا جو مرے تک علم و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ سالک نے چند سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ آغاز میں حکیم مومن خاں کو نکھام دکھایا۔ پھر غالب سے مشورہ کرنے لگے۔ پہلے قربان مخلص کیا۔ غالب نے اسے بدل کر سالک کر دیا۔ ۵ سال کی عمر میں ۱۸۸۱ء میں حیدر آباد میں فوت ہوئے۔ (ولادت: ۱۸۳۳ء؟)

فضلی ہرگوپال تفتہ، سکندر آبادی:

بھنگا گر کاسٹھ دیپ چند کی اولاد میں سے موقی لال بھنگا گر کے آٹھ بیٹوں (اٹھ گھرے) میں سے ایک ہرگوپال تھے۔ ۹۹ء (۱۲۱۳ھ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق تھا۔ انگریزی تھک بندہ بہت میں قانون گورنر ہر شاعر کی شوق میں ملازمت کو خیر باد کہا۔ کچھ عرصہ ریاست ہے پھر میں ملازمت کی اور جلد ہی اُسے بھی چھوڑ دیا۔ ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء کو فوت ہوئے۔ تفتہ ابتدا میں راوی مخلص کرتے تھے۔ جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو غالب نے مخلص بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر مرزا تفتہ بنا دیا۔ تفتہ غالب کے محبوب شاگردوں میں سے تھے۔ تفتہ عمر بھر فارسی میں شعر کہتے رہے اور فارسی میں چار دیوانہ یادگار چھوڑے۔

مرزا احاطم علی بیگ مہر:

مہر ۱۸۱۵ء/ ۱۲۳۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد فیض علی بیگ انگریزی عملداری میں تحصیلدار تھے۔ کم عمری میں والد فوت ہو گئے۔ والدہ نے اچھی تعلیم دلوائی۔ ۱۸۳۰ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر ہوئے (چند گزٹھ)۔ مہر ناخ کے شاگرد ہوئے۔ انگریزی حکومت نے اُن کی خدمات کے اعتراف میں امراؤں بھی دیا اور دو گاؤں بطور جاگیر مطاع کیے۔ مہر لکھنؤ سے آگرہ آ گئے اور وہاں دکالت شروع کر دی۔ ۱۸۷۹ء میں فوت ہوئے۔
فشی شیونرائٹن آرام:

آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ولادت: ۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء۔ بچپن میں والد فوت ہو گئیں۔ آرام کی تعلیم وتر بیت اچھے پانے پر ہوئی۔ آگرہ کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انگریزی اور فارسی کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہو کر اسی کالج میں انگریزی کے مدرس مقرر ہوئے۔ (۱۸۵۶ء) دو سال بعد محکمہ بکری میں ملازم ہوئے اور پھر کئی دوسرے محکموں میں کام کیا۔ فشی جی کے نام سے مشہور تھے۔ رفاہ عام کے کاموں میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ اُن کی طبی سرگرمیوں میں مطیع منید الخدائق کا خاص مقام ہے جس میں غالب کی دو کتابیں دھنچو (۱۸۵۸ء) اور دیوان اُردو (۱۸۶۳ء) شائع ہوئیں۔ ۱۸۷۷ء میں رائے بہادر کا خطاب ملا۔ ۲ ستمبر ۱۸۹۸ء کو فوت ہوئے۔
میر مہدی حسین امجدی:

پیدائش دہلی ۱۸۳۳ء۔ ۱۸۵۷ء کے بنگالے میں پانی پت چلے گئے۔ امن قائم ہوا تو دہلی آئے۔ پھر ملاش روزگار کے لیے الودہ پور میں رہے آخر رام پور میں آ کر اقامت کی۔ رام پور میں بقیہ ایام آرام سے گزرے۔ آخری عمر میں بھائی جاتی رہی۔ رام پور میں ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء (۱۷ صفر ۱۳۲۱ھ) کو فوت ہوئے۔ غالب کے بہت محبوب شاگردوں میں سے تھے۔
”منظیر معنی“ (دیوان) مطبوعہ ۱۸۹۹ء جس کا اہتمام میرن صاحب نے کیا جو میر بجرجو کے شریک مکتوب الیہ اور اُن کے یار غار تھے۔

خواجہ غلام غوث خاں بیخبر:

اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ مفلوں کے زوال کے بعد امن و سکون درہم برہم ہوا

تو ترک وطن کیا۔ خواجہ غلام غوث کی ولادت ۱۲۳۱ھ (۱۸۲۳ء) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ اُن کے ماموں آگرہ ولادہ کے گورنر کے میرٹھی تھے۔ بچہ بچہ بھی ۱۸۴۱ء میں انہی کے دفتر میں ملازم ہوئے۔ ماموں کی سبکدوشی کے بعد انہیں میرٹھی بنادیا گیا۔ ۱۸۸۵ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ چٹن کے بعد آگرہ سے الہ آباد آ گئے اور وہیں ۲۶ دسمبر ۱۹۰۳ء (۱۳۲۲ھ) کو فوت ہوئے۔

انور الدولہ شفیقؒ نواب محمد سعد الدینؒ رئیس کدورہ کالپی۔

وفات ۱۸۸۲ء (۱۲۹۸ھ) کلام پند تھا۔ غالب سے پہلے قلق سے مشورہ ظن کیا۔ ایک نثری رسالہ ایک دیوان اور ایک مثنوی نگار ہے۔ نئی کریم پبلشرز کی مدد میں ایک مولود منقولہ بھی ’’مخزن سعادت‘‘ کے نام سے ۱۸۵۳ء میں شائع کیا۔

حکیم غلام نجف خاں ولد مسیح الدین

(حالات؟) پانچ برس کی عمر میں دہلی آئے۔ حکیم احسن اللہ خاں سے طب کی تعلیم پائی

اور انہی کے توسط سے میرزا غالب سے تعلق ہوا۔ اُن سے فارسی کتب طب پڑھیں۔ غالب بھی انہیں اپنے اہل خانہ میں شمار کرتے تھے اور عزیز رکھتے تھے۔

نواب یوسف مرزا (مخلص ناصر):

سید ناصر الدین حیدر خاں نام عرف یوسف مرزا لکھنوی۔ نواب حسام الدین حیدر خاں کے نواسے اور ناصر حسین مرزا کے بھائی تھے جن کی بڑی بہن سیدہ محمد نصیر عرف نواب جان سے بیاہی تھیں۔ یوسف مرزا انہیں نواب جان کے بیٹے تھے۔ یوسف مرزا ۱۸۵۷ء کے بعد عرصے تک پریشان رہے۔ اُن کے باپ کو چھانسی ہو گئی تھی۔ آخر انہیں الور میں پناہ ملی۔ مہاراجہ ان سے بہت خوش تھے۔ پچاس روپے ماہوارہ وظیفہ مقرر تھا۔ اقامت کی پابندی نہ تھی۔ طبیعت میں غرارت تھی۔ ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء-۱۸۸۳ء) میں وفات پائی۔ لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

نواب میر غلام بابا خاں:

۶ دسمبر ۱۸۴۳ء (۳ شعبان ۱۲۵۰ھ) سورت میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۹ اپریل ۱۸۹۳ء (۱۴

شوال ۱۳۱۰ھ) کو فوت ہوئے۔ اُن کے والدہ قاضی شہر اور درگاہ سید جمال الدین کے سجادہ نشین

تھے۔ شاعر نہیں تھے مگر شعرا کے قدردان تھے۔ غالب سے بھی خط و کتابت رہی اور گاہے گاہے آپس میں ملوث ہو جاتے رہے۔

میرا میراجیم علی خاں وقاصہسوانی:

میرا کبیر علی خاں کے بڑے بیٹے تھے۔ غالب ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ والد کے انتقال پر ۱۸۶۰ء میں چالیس ہوئے اور ۱۸۸۵ء میں بڑا دودھ میں فوت ہوئے۔ (جہاں انکی کے جد اعلیٰ میر سر فراد علی خاں نعل مکان کر کے آ گئے تھے۔) میرا میراجیم علی خاں کو یہاں جا گیری ہوئی تھی۔
حکیم سید احمد حسن مودودی ولد سید محمد حسن صالحی۔

وطن سہوان، ولادت ۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۸ء (۹) ابتدائی تعلیم وطن میں پائی اور تحصیل دہلی میں کی۔ غالب کے شاگرد ہوئے۔ پھر بڑا دودھ چلے گئے۔ وہاں طب کی تعلیم حاصل کی اور مطلب شروع کیا۔ ریاست بڑا دودھ میں ملازم ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۳ء میں فوت ہوئے۔

غشی، محمد تقی، فضل حسین خاں:

(کوکب قلمس) (غالب کا ایک دہلوی شاگرد) (حالات نہیں ملتے)۔ ۱۸۵۷ء کے طوئیں بنگالے کے بعد دہلی والوں نے ایک مشاعرہ کیا تھا جسے ”غنائن دہلی“ کے عنوان سے کوکب دہلوی نے ۱۲۷۹ھ میں مرتب کیا۔ جسے اکمل الطالع دہلی نے ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء میں شائع کیا تھا۔ تقریباً دوسرا قربان علی بیگ ساک۔ (طبع ثانی: اکادمی پنجاب لاہور ۱۹۵۳ء)
میاں داد خاں، سیاح اور جنگ آبادی:

یار باش اور زمرہ دل آوی تھے۔ مزاج میں بہت لطافت تھی۔ فارسی زبان بے تکلف بولتے تھے۔ سیاحت کا شوق تھا۔ جہاں جاتے لوگوں سے بے تکلف دوستی پیدا کر لیتے۔ اپنے اہتمام سے مشاعرے کرتے نہ سنے کا انداز بھی دکھائی دیتا تھا۔ اچھے خطاط اور فن مضوری کے ماہر تھے۔ شروع میں قلمس مشاق تھا۔ غالب نے بدل کر سیاح کر دیا۔ غالب نے انھیں سیف الحق خطاب بھی دیا۔

میر حبیب اللہ ذکاؤد راسی ختم حیدر آبادی:

مولدہ اولد گیر (خلع نیلور۔ مدراس) ۱۸۳۰ء (۱۲۴۳ھ) میں پیدا ہوئے۔ ابتداً کی تعلیم اپنے بڑے بھائی محمد رحمت اللہ رسا سے حاصل کی۔ علوم متداولہ و غیر متداولہ سے پڑھے۔ فارسی پر خاص تدریس تھی اور عربی بھی جانتے تھے۔ شاعری کا ابتدا سے شوق تھا۔ غالب کی شاگردی کے بعد پہلا کلام شائع کر دیا۔ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں ۲۸ سال کی عمر میں حیدر آباد آئے۔ ۱۸۷۳ء (۱۲۹۱ھ) میں فوت ہوئے۔

چودھری عبدالغفور مسرور رام ہروی:

مرزا غالب کے تخلص دوست و نیاز مند۔ انھیں سب سے پہلے غالب کے خطوط کی اشاعت کا خیال آیا مگر انھوں نے مرزا تقی اور شیونرائی آراؤں کی طرح اجازت لینے کی بجائے خطوط کی حق آوری کا کام شروع کر دیا۔ اور ”مہر غالب“ کے نام سے اسے ترتیب دے ڈالا۔ یہ مرزا غالب کا پہلا مجموعہ مکتبہ اُردو ہے۔ سرور مارہرہ (خلع لہ۔ یو۔ پی) کے رئیس تھے اور قوم کے کبیوہ۔ بقول غلام رسول مہر سرور کا انتقال بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔

مآخذ:

- ۱۔ خلافت غالب۔ مالک رام۔
- ۲۔ خطوط غالب جلد اول، جلد دوم۔ غلام رسول مہر ۱۹۶۹ء (مطبوعات یادگار غالب)

پیشکش: بزم اقبال

بلسلہ اقبالیات

اقبال: شخصیت اور شاعری

از پروفیسر حمید احمد خاں (مرحوم)

مجلد: صفحات ۱۶۸ - قیمت -/۷۰ روپے

اقبال اور ملی تشخص

از پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم "اکرام"

نہیں ریکسین کی جلد: صفحات ۳۵۶ - قیمت -/۲۰۰ روپے

اقبال، ایک مطالعہ

از پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

مجلد: صفحات ۲۹۶ - قیمت -/۱۲۰ روپے

اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء (سرگزشت اقبال)

از پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

نہیں ریکسین کی جلد: صفحات ۲۳۸ - قیمت -/۱۵۰ روپے

(سیٹ خریدنے پر خصوصی رعایت ۴۵ فیصد کے ساتھ)

ہزم اقبال کی تازہ ترین پیش کش
(۲۰۰۳ء)

تفہیمِ بالِ جبریل

از

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

نقش کاغذ - خوبصورت و مضبوط جلد - ویدہ زیر طباعت

صفحات ۳۲۸ - بڑا سائز (۳۰ x ۲۰)

قیمت: چار سو روپے

طلبہ اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت کے ساتھ

آزادی کی کہانی، اقبال اور قائد اعظم کی زبانی

قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال جہاد آزادی کے دوا ایسے عظیم رہنما ہیں جن کے فرمودات ہمیشہ مشعل راہ ہوں گے۔

بزم اقبال کی مسند رجوع طیل مطبوعات (آرڈو انگریزی) ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ قائد اعظم کی تقاریر و بیانات (انگریزی) چار جلدوں میں۔

صفحات: پچھتر ہزار قیمت فی جلد: ۳۵۰ روپے

۲۔ قائد اعظم کی تقاریر و بیانات (آرڈو ترجمہ) چار جلدوں میں۔

صفحات: نو سو پچھتر ہزار قیمت جلد اول: ۳۰۰ روپے

قیمت جلد دوم سوئم چارم: ۲۵۰ روپے

۳۔ پاکستان: تصور سے حقیقت تک

علامہ اقبال اور قائد اعظم کے افکار و فرمودات کی روشنی میں:

مجلد صفحات: ۲۸۳ قیمت: ۲۰۰ روپے

4 PAKISTAN: As Visualized by Iqbal & Jinnah.

Pages: 320, Price Rs 200/-

(رعایت: بزم اقبال کے قواعد کے مطابق۔ طلبہ۔ لیے خصوصی رعایت)

بزم اقبال۔ ۲ کلب روڈ، شارع قائد اعظم، لاہور

فون: 6363056

